یو ڈیم سالا
(افسانے)
نعیم بیگ

یو۔ڈیم۔سالا

نعیم بیگ

نام کتاب : یو۔ڈیم۔سالا
مصنّف : نعیم بیگ
اشاعت اوّل: اکتوبر 2013ء
ناشر : بک ایج پبلشرز
کمپوزنگ : حافظ افتخار احمد
مطبع : ندیم پرنٹرز
سرورق : ذیشان مظہر
اہتمام : سمٹ انٹرنیشنل
قیمت :

بک ایج پبلشرز
دوسری منزل خورشید بلڈنگ، 10/ ایبٹ روڈ لاہور
فون نمبر: 36307828، 36314383

انتساب

والدہ محترمہ کے نام

جنہوں نے ہمیشہ انسانوں

اور کہانیوں سے محبت کی ہے

ترتیب

ہجرت کے دکھ

عالمی معیشت کے جبر اور ہجرت کے دکھ کا شکار نعیم بیگ کی کہانیوں میں زندگی کا بڑا بھیانک چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ میں انہیں جانتا نہیں شاید ان کی تحریر کبھی نظر سے گزری ہو لیکن زیر تبصرہ کہانیوں نے مجھے ''ہانٹ'' کیا ہے۔ یوں تو بقول غالب ہر نفس ہستی سے تا ملک عدم اک جادہ ہے لیکن مسافت کے کرب سے جو زندگی کشید کی جاتی ہے اس کا سچ بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ اگر افسانہ زندگی کی ایک قاش، وقت کے ایک لمحے اور سلسلہ واقعات کی ایک کڑی کو مخصوص تکنیک میں پیش کرنے کے فن کا نام ہے تو نعیم بیگ مکمل کہانی کار ہے۔

''یو۔ڈیم۔سالا'' سے ''کوئل کا خط'' تک اس کی قریباً ہر کہانی ہجرت کے کرب اور معاشی استحصال کے جبر میں پھنسے تیسری دنیا کے کمزور، بے بس انسانوں کا المیہ ہے، عرصہ بعد ایسی کہانیاں پڑھنے کو ملی ہیں۔

طارق اسمٰعیل ساگر

حرفِ عنبریں

اردو افسانے نے ابتدا سے لے کر آج تک کئی رنگ بدلے ہیں، اس میں کئی اتار چڑھاؤ آئے ہیں، کئی تجربات ہوئے ہیں اور اسے طرح طرح سے مشق ستم بنایا گیا ہے۔ اوّل اوّل اساطیری رنگ کے افسانے لکھے گئے۔ بعد ازاں اس میں حقیقت پسندی آگئی اور پھر اس کے بعد اردو افسانے کا کارواں جدیدیت کی اوبڑ کھابڑ وادی کو عبور کر کے مابعد جدیدیت کے دور میں داخل ہو گیا۔ اس دوران ایک سانحہ یہ بھی ہوا کہ اردو افسانے سے کہانی غائب ہو گئی اور صرف لفاظی رہ گئی۔ افسانہ نگار افسانے تخلیق کرنے کے بجائے دانشوری دکھلانے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ افسانے کا قاری کہیں گم ہو گیا لیکن اردو افسانہ آخر کار اس گہن سے باہر نکل آیا اور افسانے کا سورج پھر سے پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگا اور جو قلم کار جدیدیت کے دور میں آنکھوں سے اوجھل تھے وہ سامنے آگئے۔ انہی قلم کاروں میں ایک نام نعیم بیگ کا بھی ہے۔

نعیم بیگ کا جو افسانہ سب سے پہلے میری نظر سے گزرا وہ تھا۔ ''یو۔ ڈیم۔ سالا''

پہلے پہل تو اس عجیب وغریب عنوان کو دیکھ کر میں آگے بڑھ گیا لیکن پتہ نہیں کیا ہوا کہ یہ عنوان میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا اور آخر کار ایک دن میں نے اسے پڑھ ہی لیا۔ اس مختصر سے افسانے میں وہ جادو تھا کہ میں اس کا اسیر ہو کر رہ گیا اور فوراً ہی اسے اپنے زیر ترتیب رسالے ''ثالث'' کے لئے منتخب کر لیا اور اب جبکہ رسالہ شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے اور قارئین کی گرانقدر آرا موصول ہو رہی ہیں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرا انتخاب غلط نہیں تھا۔

نعیم بیگ کی سماج پر گہری نظر ہے۔ روزمرہ کے واقعات ان کی نظروں کے سامنے سے گزر کر کہانی کا روپ دھارن کر لیتے ہیں اور پھر اس کہانی کو وہ نہایت مشاقی اور فنکاری کے ساتھ افسانے کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ ''ستار بھائی'' ان کا ایسا ہی افسانہ ہے۔ ہم آئے دن دہشت گردی کے واقعات سنتے رہتے ہیں اور ٹی وی پر بھی دیکھتے رہتے ہیں۔ اس موضوع پر بھی فی زمانہ کئی افسانے لکھے گئے ہیں لیکن ان افسانوں میں صرف دہشت گردی کے واقعات اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہیوں کا ذکر ہوتا ہے لیکن ''ستار بھائی'' میں افسانہ نگار نے افسانے کے مرکزی کردار کی جو نفسیاتی گرہیں کھولی ہیں اس کا جواب نہیں۔

نعیم بیگ کی ایک بڑی خوبی ان کی مکالمہ نگاری ہے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ کہنہ مشق افسانہ نگار بھی کرداروں کی زبان لکھنے میں غچہ کھا جاتے ہیں۔ ایک ناخواندہ کردار نہ صرف فصیح وبلیغ زبان میں گفتگو کرتا نظر آتا ہے بلکہ نہایت دقیق مسائل پر فلسفیانہ بحث کرتا بھی دکھائی دیتا ہے۔ نعیم بیگ کی مکالمہ نگاری بالکل فطری انداز کی ہوتی ہے اور قاری اسے فوراً قبول کر لیتا ہے۔

’’جلتے فرشتے‘‘ اور’’ آخری لمحہ‘‘ بھی کامیاب افسانے ہیں جن میں آج کے حالات نہایت چابکدستی کے ساتھ قلم بند ہوئے ہیں۔

نعیم بیگ کو بیانیہ پر بھی قدرت حاصل ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں وہ کافی محتاط نظر آتے ہیں۔ افسانے کو خواہ مخواہ طویل نہیں کرتے لہٰذا ان کے افسانوں کے پلاٹ چست اور درست ہوتے ہیں۔ کہیں کوئی جھول نہیں، کوئی ڈھیلا پن نہیں۔ جیسے کسی ماہر سنگ تراش کی بنائی ہوئی متناسب کایا کی مورتی۔

نعیم بیگ کا قلم ابھی جوان ہے۔ امید ہے کہ وہ تادیر اردو ادب کو کامیاب افسانے دیتے رہیں گے۔ (آمین)

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد
مدیر اعلیٰ ’’ثالث‘‘
مونگر، بہار۔ انڈیا

زاویہ شہاب

نعیم بیگ کے فن اور شخصیت پر نظر ڈالی جائے تو یقیناً فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ بحیثیت انسان بڑے ہیں یا بحیثیت فنکار۔ ان کی شخصیت کے بارے میں دل دلائل دیتا ہے تو اُن کے فن کے بارے میں دماغ۔ بہر حال جیت نعیم بیگ کی ہی ہوتی ہے۔ تخلیق ادب کے میدان میں نعیم بیگ کا یہ دوسرا جنم ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں انھوں نے شاعری، کالم نگاری کے میدانوں میں طبع آزمائی کی تاہم ناول نگاری اور افسانہ نگاری ان کے دوسرے جنم کا شاخسانہ ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی گرفت بھی ان دو اصناف میں زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ نعیم بیگ کا تعلق ادب کے ان معدودے چند افراد سے ہے جو بیک وقت اردو اور انگریزی زبان میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ میں تو اپنے آپ کو ان کے فن افسانہ نگاری و ناول نگاری پر تبصرہ کرنے کا اہل نہیں پاتا تاہم اردو ادب اور ایشیا کے سب سے بڑے جاسوسی ناول نگار ابن صفی کے صاحبزادے جناب احمد صفی نے ان کے ایک ناول کے کچھ ابواب پڑھ کر اس میں

آئن فلیمنگ (وجہ شہرت جیمز بانڈ والے ناول) کی مشابہت محسوس کی۔ نعیم بیگ کا ادبی میدان میں دوبارہ جنم لینا یقیناً خوش آئند ہے۔ میری ان سے ملاقات بھی ان کے دوسرے جنم میں ہی ہوئی ہے۔ وہ اپنے پہلے انگریزی ناول کے مسودے کو لے کر میرے پاس آئے تو مجھے ان میں کھلا ہوا (چھپا ہوا نہیں) فنکار نظر آیا۔ میری ناچیز رائے کو انہوں نے کافی اہمیت دی چنانچہ ہر بار ادب کے افق پر ایک نئی تخلیق لے کر طلوع ہوئے۔ آج نعیم بیگ کے دامن میں بے شمار ادبی موتی اپنی کرنیں بکھیر رہے ہیں۔

میں نعیم بیگ کے چند افسانے اور ایک ناول پڑھ پایا ہوں مجھے آبِ گم نامی افسانہ ان کے تمام افسانوں میں بہتر دکھائی دیا۔ بہرحال یہ 'ذاتی پسند' کی بات ہوسکتی ہے ممکن ہے کہ اُن کے دوسرے افسانے زیادہ بہتر ہوں۔ نعیم بیگ ایک باغی فنکار ہے اور انہوں نے ایک باغی کی طرح ہی قواعد وضوابط کے بندھنوں کو توڑ ڈالا ہے۔ ایک کہانی کار کی طرح انہوں نے کہانی لکھی ہے۔ اپنے کرداروں کی نفسیات ڈھکے چھپے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک وقت تھا کہ وہ اردو میں لکھنے سے کتراتے تھے مگر آج وہ صرف اردو میں ہی لکھ رہے ہیں۔ ان کی تحریروں میں اہم بات یہ ہے کہ ان کی ہر نئی لکھی جانے والی تحریر گزشتہ سے بہتر ہے۔ اس لحاظ سے نعیم بیگ کو زیادہ سے زیادہ لکھنا چاہئے تاکہ ان کا اور دوسروں کا بھلا ہو۔

سلیم شہاب

میرے تخلیقی محرکات

دل میں جولانی ہوتو آنکھوں سے شرارت ٹپکتی ہے اور لبوں سے گاہے بگاہے
مصرعے یوں پھولوں کی طرح جھڑتے ہیں اور ایسے ایسے خیال آتے ہیں کہ اللہ حفظ و
اماں میں رکھے اور پھر اگلے ہی لمحہ دل اگر بجھا بجھا سا ہوتو سر گردانی کی رو میں غالب بھی
دھرتی پر بوجھ کی طرح دماغ پر یوں ہتھوڑے برساتا ہے کہ آدمی دیکھتا رہ جائے۔

گزشتہ سالوں میں ایسے ہی کچھ دن میرے ساتھ برتاؤ کر رہے تھے۔افریقہ
کے پے در پے دوروں سے طبیعت کچھ نڈھال سی تھی۔ کام کی زیادتی ذہنی تناؤ میں
اضافہ کر رہی تھی۔ لکھنے پر طبیعت بے تحاشا مائل تھی لیکن فسوں سازِ غمِ دوراں یوں سر پر
سوار تھا کہ نظر کہیں اور جاتی ہی نہ تھی۔ اس پر ایک خیال اپنی درماندگی کا احساس دلاتا
کہ یوں بندہ مزدور کے اوقات انسان کو بے حس کیئے جاتے ہیں کیوں نہ میں اسے
جواباً بے بس کر دوں۔ یہ سوچ کر قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کر دیا۔شاید شام کا وقت تھا یہ

پڑھتے ہوئے آپ کو اچنبھا سا لگے گا کہ اپنے پہلے افسانے کا انجام اور آخری چند لائنیں اگر میں یہ کہوں کہ میں نے نہیں لکھیں بلکہ میرے لاشعور نے اسے قلم کی نوک سے اُگل دیا تو سچ مانیئے کہ یہ سچ ہے اور یوں میرے افسانوں کی دنیا آباد ہوئی۔

زندگی کی کشتی کو بے کراں سمندر کی لہروں پر کھیتے ہوئے مجھے ہمیشہ دو تپتے خشک اور لامتناہی صحراؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک عالمی معیشت کا جبر اور دوسرے ہجرت کا دُکھ۔ عالمی معیشت کا میں نے خود سامنا کیا اور ہجرت کے دکھ کو میں نے اپنے جدِّ امجد سے وراثت میں پایا۔ اس عالمی معاشی نظام نے جس طرح ظلم، ناانصافی اور معاشی جبر کی دنیا میں ایک مثال پیش کی ہے اور اس سے مجبور ہو کر ہجرت کرنے والے اور جا بجا بھٹکنے والے لاکھوں انسان اور خصوصاً دیارِ غیر میں رہنے والے پاک و ہند، جنوبی ایشیا اور مشرقِ بعید کے نوجوان اپنے خون سے سرزمین عرب، یورپ اور امریکہ کو سینچ رہے ہیں کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ صرف بھوک ہے جو عالمی عفریت کے بھیس میں دیگر تمام معاشی نظاموں کو ہڑپ کرنے کے لئے پَر تول رہی ہے۔ یہ ایک ایسی آفاقی لہو رونا ہے جو دیارِ غیر میں اندر تک جھنجھوڑ دیتا ہے اس کے بعد صرف خدا کی خدائی سے انکار رہے۔ اسی پس منظر کو متوازن کرنے کے لئے ادیب بھی حتی المقدور اس کے ساتھ اپنی ازلی دشمنی کو پالتا میدانِ کارساز میں نبرد آزما ہے اور اپنی جد و جہد کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ مغرب میں بھوک و افلاس پر کہیں بہتر ناول، افسانے اور ادبی تحریریں بیسویں صدی کا جھومر بنیں۔ روس سے ٹالسٹائی نے پیالہ لکھ کر، فرانس سے جین پال سارتر نے دوام اور دیوار لکھ کر، چیکوسلاویکیہ سے فرانز کافکا نے محتاج اور انصاف لکھ کر اور فرانس سے ہی یاں یانے نے بھوک اور امریکہ سے او ہنری نے

بے گناہ لکھ کر اپنے دکھوں کا اظہار کر دیا۔ کمال تو یہ ہے کہ چین اور مشرقِ بعید کا ادب بھی اس پر چِلّا رہا ہے۔ ہم آپ صرف یہی تو کر سکتے ہیں چاہے کوئی ہماری چیخوں کو سنے یا نہ سنے....

ایک بات اور، اس دشت کی سیاحی میں میرا ذاتی مشاہدہ بھی یہی رہا۔ افریقہ، انگلستان و یورپ اور مڈل ایسٹ میں جہاں جہاں خاکسار نے قدم رکھے میرا پہلا استقبال صرف اور صرف بھوک ہی نے کیا۔ تب بھی میں نے اپنے یقین کو یہ کہہ کر محکم کیا اس عفریت سے گھبرانا نہ؟ تم اسے اپنے آدرش اور سچ کی بنیاد پر جو قدرت نے تمہارے اندر گھول رکھا ہے، شکست دے سکتے ہو۔ اور یوں میں نے ہمیشہ بازی جیتی۔

ہمارے ہاں افسانہ کی روایت کو ساتھ لیتے ہوئے ہجرت کا غم بھی ایک دلخراش کہانی سناتا ہے۔ میں یہاں تقسیم کی بات تو نہ کروں گا لیکن اس کے بعد دونوں طرف انسان کا المیہ ایک ہی جیسا رہا۔ صرف ظلم اپنی شکلیں بدل بدل کر لاکھوں انسانوں کو مسلسل ہجرت پر مجبور کر رہا ہے۔ کبھی وطنیت اور کبھی دھرم و مذہب کا نام لیا گیا اور کبھی اپنی جھوٹی انا، لیکن اندر کا بورژوائی غلیظ نظام اپنی جڑیں مضبوط کرتا رہا۔

پھر یہاں اسّی کی دہائی اور اس کے بعد شعور کی آنکھ کھولنے والے نوجوانوں کو ایک ایسی ہی دنیا ملی تھی جہاں ایک طرف نظریات کی جنت جمہوری اور خاکی آمروں کے ہاتھوں تہس نہس ہو رہی تھی اور دوسری طرف سنگینوں پر اڑے انسانی جسم کے لوتھڑے اپنا لہو آسمان کی طرف اچھال رہے تھے کہ شاید نور کی کسی کرن کا ظہور ہو اور یہی پس منظر میری فکری اساس کا پیش خیمہ رہا۔ میں نے حقیقی زندگی کو کبھی سراب یا کبھی روحانی طلسم کدہ میں رکھ کر نہیں دیکھا اور نہ ہی ایسے سہاروں کی ضرورت کبھی محسوس

ہوئی۔ میں نے اپنے افسانوں میں کوشش کی کہ حقیقت کی تھکا دینے والی چکا چوند روشنی میں جہاں ایک طرف پوری تازگی اور بشاشت نظر آئے وہیں لہجے کا کھردرا پن اور سادگی قاری کا دل موہ لے۔ اسی ضمن میں ایک اعتراف بھی اور وہ یہ کہ ان افسانوں میں مَیں نے عالمی اور انسانی محبت کا جو جذبہ اپنے خونِ جگر سے سینچا وہی قلم نے قرطاسِ ابیض پر اتارا۔

اگر آپ ان افسانوں کو موضوعات کے حوالوں سے دیکھیں تو ان کا فنکارانہ شعور مشاہدہ کی طاقت کے ساتھ اپنی سیماب صفت میں ڈوبا نظر آئے گا اور یہی وجدان حقائق اور مشاہدات کو یکجا کرنے میں میرے فکری اسلوب کا عکاس ہے اور سچ تو یہی ہے کہ انہی دو عناصر پر مبنی سچائی اور حقیقت کی طرف میری جستجو کا سفر ہے۔

میرے خیال میں بنے بنائے سانچے میں تخلیق کو ڈھالنا بالکل مشینی انداز سے ایک جیسے سینکڑوں برتن بنانے کے مترادف ہے۔ تاہم اس کے اندر ایک اور سوال چھپا ہوا ہے وہ یہ کہ کیا پھر روایت اور افسانہ کی طے شدہ اجزائے ترکیبی سے انحراف کر دیا جائے؟ ہاں وقتاً فوقتاً ایسے تجربات ہوئے لیکن پھر وہ افسانہ نہ تو قاری کے ہاتھوں قبولیت کی مسند پر بیٹھا اور نہ ہی کسی نقاد نے سراہا۔ بالکل اسی طرح جیسے چیخوف کے ساتھ شہزادی کے مکالمہ میں ہوا۔ اسی لئے میری رائے میں ایسے ایک ہزار افسانے لکھنے سے بہتر ہے کہ آپ کم لکھیں لیکن مکمل لکھیں اور افسانے کو ہر طرف سے توانا رکھیں۔ اس کی لطافت اور معیار کو اس کے نفسِ مضمون پر ترجیح تو دیں لیکن جس موضوع پر قلم اٹھے تو قاری کو احساس ہو کہ قلم اٹھا ہے۔ دراصل تخلیق ایک ایسا عمل ہے جہاں ادیب کی کوتاہی اس کو مقصدِ تخلیق سے الگ کر دیتی ہے۔ ایک اچھا افسانہ اپنا مکالمہ خود

ہی پڑھنے والوں سے کرتا ہے۔ تخلیق اور قاری کا رشتہ اس رشتہ سے زیادہ مقدم اور مضبوط ہوتا ہے جو کسی افسانہ نگار کی شہرت کے حوالے سے استوار ہو۔ کہانی زندہ ہوگی تو کہانی کار زندہ رہے گا۔

انسان کی انفرادی حیثیت میں تبدیلی کے لئے جو اجزا کارِ ہائے نمایاں انجام دیتے ہیں ان میں ادب کا کچھ حصہ اس وقت شامل ہوتا ہے جب شعوری طور پر انسان ادب کو سمجھنے کے قابل ہوتا ہے ورنہ جیسا کہا جاتا ہے اور تحقیقات بھی ثابت کرتی ہیں کہ انسان کی شخصیت اس کے ابتدائی دور میں ہی تقریباً مکمل ہو جاتی ہے تاہم اس کا ارتقائی سفر تاحیات جاری رہتا ہے اور اسی بیچ میں ادب بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ ایک بات اور، ادب شخصیات سے زیادہ معاشرتی اور سماجی شعور پر اثر انداز ہوتا ہے جس کی انسپریشن فرد کی ذاتی زندگی پر نظر آتی ہے۔ میں بھی اسی خوش گمانی کا شکار ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ میری تحریریں آپ تک سچ کا منصف بن کر سامنے آئیں۔ اس لئے کہ مجھے قاری سے تو صرف داد ہی لینا ہے لیکن میں اپنے اندر کہاں کہاں جواب دیتا رہوں گا۔

میری عادت رہی کہ لکھنے کے بعد تحریر کو ایک دو دن کے لئے چھوڑ دیتا ہوں تا کہ کہانی کے سحر سے نکل کر اس کی ایڈیٹنگ کر سکوں۔ وہی حسب عادت ہوا اور جب میں انجام کار اس کتاب کے آخری افسانہ پر پہنچا تو میرے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ یہ ایک قاری کے آنسو تھے یا رگوں میں دوڑتے پھرتے خون کے قطرے جو ایک لکھاری کی آنکھوں سے ٹپکے تھے اس کا ادراک میں آج تک نہ کر سکا۔

اس مجموعہ کو ’یو۔ ڈیم۔ سالا‘ کا عنوان دیتے ہوئے میں سوچ رہا تھا گو اس مجموعہ

کی قبولیت کی سند پہلے ہی قارئین دے چکے ہیں جب اس مجموعے کے چند منتخب افسانے ملکی اخباروں نے چھاپے اور عالمی افسانہ میلہ میں پیش کئے گئے۔ تاہم اب کتابی صورت میں آپ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ رہا ہوں۔ گر قبول افتد۔

نعیم بیگ

ستمبر 2013ء

یو۔ڈیم۔سالا

پام ڈیرہ بیچ کورنش پر شام کے سائے پھیل رہے تھے۔نوجوان لڑکے اورلڑکیوں کا ایک ہجوم کورنش کی دیوار کے ساتھ ساتھ چہل قدمی میں مصروف تھا۔سورج دور سمندر کے اس پار ٹھہرے ہوئے پانی کے اندر آہستہ آہستہ آسمان کی وسعتوں پر نارنجی رنگ بکھیرتا ہوا غروب ہورہا تھا۔چھوٹے چھوٹے بادل ٹکڑیوں کی صورت میں قطار در قطار تیرتے ہوئے مشرق کی جانب سفر کررہے تھے۔

کورنش کی تین فٹ اونچی اور کافی چوڑی دیوار پر بیٹھا ایک نوجوان اپنے سامنے اخبار کے چند صفحات پھیلائے پڑھنے میں مصروف تھا۔پچھلے دودن سے تو میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا یہ معمول تھا۔وہ شام ہونے سے پہلے اخبارات کا ایک پلندہ اٹھائے کورنش پر آجاتا۔پہلے وہ چند منٹ آہستہ آہستہ واک کرتا اور پھر برسک واک کرتے ہوئے

کورنش کے دونوں طرف گھوم کر اپنی مخصوص جگہ پر آ کر بیٹھ جاتا اور اخبار کا مطالعہ کرتا۔ بظاہر شکل سے وہ انڈین لگتا تھا۔

پام ڈیرہ بیچ دبئی کے مشہور تجارتی علاقے ڈیرہ میں واقع ہے۔

ایک طرف آسمان سے باتیں کرتی ہوئیں بلند و بالا عمارتیں جن میں سب سے بڑی عمارت حیات ریجنسی نامی مشہور ہوٹل ہے۔ دوسری طرف سامنے نائف کا بازار اور تجارتی مرکز۔ لہٰذا بیچ کورنش پر شام ہوتے ہی سینکڑوں رہائشی اور نوجوان سیّاح آ جاتے۔ دوپہر کو البتہ گرمی ہونے کی وجہ سے یہ جگہ تقریباً سنسان ہی رہتی۔

آج جب میں نے اس نوجوان کو دوبارہ دیکھا تو میرے اندر تجسس نے انگڑائی لی اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

''آپ کے پاس ماچس ہوگی؟'' میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

اُس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور انکار کرتے ہوئے سر ہلا دیا اور دوبارہ اخبار میں منہمک ہو گیا۔ میرا تجسس اور بڑھ گیا۔ اور میں اچھل کر اس کے پاس ہی دیوار پر بیٹھ گیا۔

میں ابھی اسی سوچ میں غلطاں تھا کہ کس طرح اس سے بات کی جائے کہ واک کرتے ہوئے قدرے ادھیڑ عمر کے ایک شخص نے اسے چلتے چلتے مخاطب کیا:

''ہیلو اشوک''۔ نوجوان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور جواباً ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''سی یو، ٹو مارو''۔ یہ کہتا ہوا وہ شخص آگے نکل گیا۔

ہوں تو میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ لڑکا انڈین نکلا۔ میں نے دل میں سوچا یوں تو دبئی

جیسے شہر میں ذات پات، برادری، رنگ و نسل، مذہب اور کسی بھی ملک کا شہری ہونا کوئی خاص بڑی بات نہیں ہے۔ یہاں صرف دو طبقات ہیں۔ ملکی اور اور غیر ملکی یعنی تارکین وطن۔ ملکی مالک و آقا ہیں اور تارکین وطن چاہے کسی بھی ملک سے ہوں ورکر ہیں۔

یہ سوچ کر اشوک مجھے کچھ اپنا اپنا سا لگا۔ اور میں نے اپنی ہچکچاہٹ دور کرتے ہوئے خود ہی اس سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

''اچھا تو تمہارا نام اشوک ہے۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟''

اشوک نے میری طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ میں بات کرنے کے لئے ابتدا کر رہا ہوں۔ لہٰذا اس نے اخبار ایک طرف کھسکایا اور انگریزی میں بولا:

''یس آئی ایم اشوک۔ اشوک شری واستری پٹیل، اینڈ آئی ایم فرام گجرات انڈیا۔'' اعتماد اس کے لہجے میں نمایاں تھا۔ ''آئی ایم سوری، بٹ مجھ کو اردو نہیں آتا''۔

''ڈو یو سپیک انگلش'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں تھوڑی بہت انگریزی تو سبھی بول لیتے ہیں حالانکہ مجھ جیسے گریجویٹ کو تو انگریزی فر فر آنی چاہئے۔ لیکن ہمارے ہاں ایسا ماحول نہیں ہے۔ لہٰذا میں بھی بس ٹوٹی پھوٹی انگریزی ہی بول سکتا ہوں۔

چونکہ مجھے بات کرنی تھی لہٰذا میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی کا ہی سہارا لیا۔

''یس آئی سپیک انگلش بٹ ویری لٹل''۔

اشوک میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا ''نو پرابلم چلے گا''۔

''تم کدھر کا ہے؟''

''میں پاکستان سے ہوں'' میرا لہجہ قدرے مایوسانہ سا تھا۔

''وِچ سٹی؟''

''کالا پل کلوز ٹو لاہور''

''اوہ یو آر فرام پنجاب۔ آئی لو پنجاب''

''یس، یس'' میں نے فوراً اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی اشوک نے اپنا داہنا ہاتھ میری طرف مصافحہ کے لئے بڑھایا اور بولا

''ویری نائس ٹو سی مائی فرینڈ''....

اسے میرا نام جاننے کے لئے خاموش ہونا پڑا''۔

''میرا نام ....اوہ سوری مائی نیم از منظور علی'' اور میں نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے اس کے مصافحہ میں گرم جوشی کا ایک طوفان سا محسوس کیا۔ اور سچ پوچھئے تو میرے اندر بھی کچھ ایسے ہی جذبات تھے۔ میں کافی دنوں سے دبئی میں رہ رہا تھا لیکن کسی اچھے انسان کی دوستی سے محروم ہی تھا۔

پچھلے چند دنوں سے نوکری کی تلاش نے مجھے تقریباً ادھ موا ہی کر دیا تھا۔ لیکن میں بھی ہمت ہارنے والے انسانوں میں سے نہ تھا لہٰذا کوشش جاری تھی۔ وہ الگ بات کہ نوکری کی امید اب دن بدن مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

''تم کیا کرتا ہے؟''

اشوک کے سوال پر میں خیالوں سے نکل آیا۔ میں نے ہچکچاہٹ سے ایک سگریٹ نکالی اور ماچس کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''بھائی صاحب، ماچس ہوگی''۔ میں نے گزرتے ہوئے ایک شخص کو سگریٹ پیتے دیکھ لیا تھا۔ وہ شخص رکا اور مجھے سلگانے کے لئے اپنی سگریٹ پیش کر دی۔ میں

نے اپنی سگریٹ سلگائی اور اسے شکریہ کہا اور دوبارہ اشوک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ابھی تک کچھ نہیں'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ ویری بیڈ، بٹ نو پرابلم'' دونوں ایک ساتھ ڈھونڈھے گا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ اخبار کا مطالعہ اتنی باقاعدگی سے کیوں کرتا ہے۔

''اپنا سٹوری بولو؟''

لمحے بھر کیلئے مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ پھر ایک چھما کا سا ہوا۔

''میری سٹوری کچھ خاص نہیں۔ لاہور کے قریب کالا پل ہمارا گاؤں ہے۔ ماں باپ دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ماں بیمار رہتی ہے۔ ایک بہن اور چھوٹا بھائی۔ میں سب سے بڑا ہوں۔ شروع میں باپ کے ساتھ کھیتی باڑی کی، پھر منڈی کا کام، پھر لاہور سے گریجویشن کی اور دو سال نوکری ڈھونڈھتا رہا۔ گزارہ تو چلتا تھا لیکن مستقبل نہ تھا۔ ایک دوست کے مشورے پر یہاں چلا آیا۔ باپ نے بیل کی جوڑی بیچ دی اور پیسے دیئے۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر یہاں معاملہ نہ بنا تو آگے کیا ہو گا؟''۔

''بس اپنی تو یہی کہانی ہے۔ فصل کی بوائی کے دن آنے والے ہیں۔ بیل نہ ہوئے تو ابا کھیت کیسے بوئیں گے۔ فی الحال تو یہی فکر ہے۔''

''سیم ڈیم سٹوری'' اشوک نے قدرے منہ بنا کر کہا۔

''تم بولو تمہاری کیا کہانی ہے؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''سورت معلوم ہے؟''

''سورت؟'' میں نے انکار میں سر ہلایا۔

''او کے۔ آئی ٹیل یو''

''گجرات میں سورت کے نام کا ایک بڑا شہر ہے۔ احمد آباد کے قریب ہے۔ جیادہ تر کاروباری لوگ رہتا ہے۔ ہم لوگ بھی ادھر رہتا ہے۔''

''مائی فادر ٹیلر ماسٹر ہے اینڈ آئی ھیٹ دس جاب''

''سو آئی ٹولڈ مائی فادر۔ آئی ول ناٹ ورک ایز ٹیلر ماسٹر۔ آئی ڈڈ مائی ماسٹرز فرام احمد آباد۔ بٹ یو نو اِن انڈیا نو جاب ایٹ آل۔ پھر مدر بولا، آئی گو یو مائی جیولری، یو گو ٹو دبئ۔ پھر ہم یہاں آ گیا۔''

''یہ سیکنڈ منتھ ہے۔ سٹل نو جاب''

''تو پھر اب گزارہ کیسے کرتے ہو'' میں نے پوچھا۔

''ایک دوست کو بیڈ سپیس کا پیسہ دیا۔ فار ٹو منتھ۔ ادھر رہتا ہے۔ شام کو ایک ہوٹل والے سے بات کیا ہے، ادھر نائف میں۔ اب رات کو دس بجے اس کے پاس جائے گا۔ اس کے ہوٹل کا سارا برتن دھوئے گا پھر وہ رات کا کھانا دے گا اور صبح کا ناشتہ۔ بس ابھی تک ایسے ہی گزارہ کرتا ہے۔''

''تو سارا دن کیا کرتے ہو؟'' میں نے رنجیدگی سے پوچھا۔

''بس جاب کا تلاش۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ شام کو کورنش پر آ جاتا ہے۔ گلف نیوز میں جاب تلاش کرتا ہے اور اپنا بھوک اور پیاس کو رات تک روک کر رکھتا ہے۔''

''بس۔ اب ٹائم ہونے والا ہے، کچھ دیر میں جائے گا، کام کرے گا اور کھانا کھائے گا۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے کہا:

''کیا میں بھی تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں۔ آئی ول شیئر یور ورک۔''

اشوک نے کچھ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا:

’’یو۔ڈیم۔سالا۔کل رات سے بھوکا پیاسا ہے اور بولتا نہیں ہے۔‘‘

اور آگے بڑھ کر اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

آخری لمحہ

جب انسان خوش قسمتی اور بدنصیبی کے درمیان مقدر کے تنے ہوئے رسّے پر مسلسل چل رہا ہو، پل پل بدلتے حالات اسے اس موڑ پر لے آئیں کہ بالآخر وہ بھرے میلہ میں متوازن رہنے کی کوشش کے آخری لمحے پر رسّے سے چھلانگ لگانے پر مجبور ہو جائے آپ اسے کیا کہیں گے۔ موت کی خواہش یا پُرامن نئی زندگی۔

لیکن میرا ذاتی خیال قدرے مختلف ہے۔ ناامیدی کے سمندر میں کنارے کی تلاش بہرحال زندگی کا ایک روشن پہلو تو ہے چاہے ساری عمر ہی اس میں گزر جائے۔ یہی حال کچھ ان دنوں میرا تھا۔ میں نے بچپن ہی سے غربت کے ساتھ سمجھوتہ نہ کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ منزل کٹھن تو ضرور تھی لیکن میں ابھی مایوس نہ ہوا تھا۔

ان دنوں میں نے سرکاری ملازمین کے کوارٹرز میں ایک کمرہ کرایہ پر لے رکھا تھا اور کچھ فاصلہ پر میرے اخبار کا دفتر تھا۔ صبح دیر سے اٹھتا، تیار ہو کر نذیر ٹی سٹال سے صبح کا ناشتہ کرتا اور پھر دفتر کی طرف چل پڑتا۔

میں تیز قدموں سے اپنی رفتار کو بڑھاتا ہوا ٹھنڈی سڑک عبور کر رہا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے بالے نے مجھے آواز دی ۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے ساتھ آگے آنے کو کہا۔ میں دراصل رکنا نہیں چاہتا تھا۔ بالے نے چلتے چلتے میرا حال پوچھا اور شام کو نذیر ٹی سٹال پر چائے کی دعوت دے دی۔

مجھے یہ احساس مارے جا رہا تھا کہ آج شاید اخبار میں میرا آخری دن ہو گا کیونکہ ایڈیٹر ذکاء الدین نے مجھے کل شام ہی وارننگ دی تھی کہ اگر تم کل بھی دیر سے آئے تو اپنی نوکری کا آخری دن سمجھنا۔ لہٰذا بالے کی دعوت پر میں فوری طور پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کر سکا اور ہوں، ہاں ہی کرتا رہا۔ لیکن اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے دیکھ کر مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ ملاقات ضرور ہو گی۔

محمد اقبال جسے محلّہ میں سب لوگ بالے کے نام سے جانتے تھے کو میں بہت زیادہ تو نہیں جانتا تھا لیکن جو کچھ اِدھر اُدھر سے معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ وہ اس میدان میں کچھ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ تاہم اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ عورتوں کی دلالی کرتا ہے۔

ان دنوں میں اچھی خاصی مالی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ ایک تو قلیل تنخواہ اور کمرے کا بڑھتا ہوا کرایہ اور بل وغیرہ اور روزمرہ کے اخراجات الگ۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ زندگی کی بھاگ دوڑ میں کیونکر جاری رکھ سکوں گا۔

بہرحال شاید اس دن قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ایڈیٹر ذکاء الدین حسب معمول اپنی سیٹ پر براجمان کاغذوں کے ڈھیر میں اپنی قسمت کا ستارہ ڈھونڈھ رہے تھے۔ انہوں نے میری آمد کو محسوس تو کیا لیکن خاموش رہے بلکہ ایک پلندہ میری طرف کھسکا کر مسکرانے لگے۔ جواباً مجھے بھی مسکرانا پڑا۔

''آج بہت خوش اور مسکرا رہے ہو'' انہوں نے خوشدلی سے سوال داغ دیا۔

''جی ہاں، آج بالے نے شام کو پانچ بجے چائے کی دعوت دی ہے، اس لئے خوش ہوں'' میں نے ازراہِ تفنن ہلکے پھلکے انداز میں انہیں چھیڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسی دعوتیں وہ کبھی رد نہ کرتے تھے اور میں کبھی قبول نہ کرتا تھا۔ وہ تو سہواً جلدی میں سب کچھ ہو گیا۔

''تو چلو ٹھیک ہے۔ میں بھی ساتھ چلوں گا، مجھے تمہاری دعوت قبول ہے۔'' انہوں نے دعوت اس طرح قبول فرمائی کہ میری روح فنا ہو گئی۔ بہرحال قہر درویش برجان درویش۔ چونکہ انہوں نے کافی دنوں سے مجھے دباؤ میں رکھا تھا لہٰذا اس سرکاری دباؤ کو ختم کرنے کے لئے میں نے جواباً منع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

شام کے سائے جب لمبے ہونے لگے تو مجھے اچانک بالے کی دعوت یاد آئی۔ وقت دیکھا تو تقریباً پانچ ہی بج رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اپنے کاغذات کو سنبھالا اور ذکاء الدین کی طرف دیکھا تو وہ کسی خاتون سے فون پر باتیں کر رہے تھے۔

باتیں کیا تھیں۔ بس یکطرفہ داستانِ عشق تھی جو مجھے تو ازبر ہو چکی تھی اور یہ ان کا کمال تھا کہ کام کی زیادتی میں بھی وہ عشق کے لئے کچھ وقت نکال لیتے تھے۔

میں نے انہیں اپنی کلائی کی طرف گھڑی دکھاتے ہوئے اشارہ کیا تو انہوں نے جلدی سے سر ہلایا اور اپنی بات کو مختصر کر دیا اور جھٹ سے فون رکھ دیا۔

''لو، میں تو بھول ہی گیا تھا کہ آج تم نے چائے کی دعوت دی ہے۔''

ذکاءالدین جیسا ذہین اور فطین شخص آج تک میری نظروں سے نہ گزرا ہوگا۔ اس قدر خوبصورتی کے ساتھ بات کو اپنی مرضی کے مطلب پہنانے میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ اب بالے کی دعوت خود بخود میری دعوت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ خوف مجھے یہ تھا کہ ساتھ میں انہوں نے رات کا کھانا بھی اسی طرح قبول فرمالینا ہے کہ میری ایک ہفتہ کی تنخواہ تو اس پر اٹھ جاتی۔ اب کچھ نہ ہوسکتا تھا۔ لہٰذا ان کا ساتھ دینے میں ہی عافیت سمجھی۔ ہم دونوں جب دفتر سے نکلے تو پانچ سے اوپر کا وقت تھا۔ چونکہ فاصلہ زیادہ نہ تھا اور ذکاءالدین کی ''حسینہ'' مٹی میں اَٹی اپنے ٹائروں پر صدیوں کی دھول جمائے سڑک کے پارفٹ پاتھ کے ساتھ ایستادہ تھی جسے وہ بزعمِ نشاط ''میری جان'' کہتے تھے اور دفتر والوں نے اس کا نام ''حسینہ'' رکھ چھوڑا تھا۔ حسینہ کا کوئی دروازہ باہر سے نہ کھلتا تھا۔ وہ چابی سے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے، دھم سے سیٹ پر براجمان ہوتے، اپنی سانس درست کرتے اور پھر باری باری اندر سے تمام دروازے کھولتے۔

اس بار بھی یہی مشق دہرائی جانی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے پہلا قدم ہی بوجھل ہو گیا۔ کافی دیر تک چابی چاروں طرف گھمانے کے باوجود دروازہ نہ کھلا۔ میں گاڑی کی دوسری طرف کھڑا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ جب ذکاءالدین کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوتے دیکھے تو میں ان کی طرف چلا گیا اور ان کے ہاتھ سے چابی لے کر خود دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔

ذکاءالدین نے دوبارہ چابی تھامی اور قدرے غصے سے ایک جھٹکا دیتے ہوئے دروازے کے ہینڈل کو خوب جھنجھوڑا مگر آج ''میری جان'' نے ہاں کرنے سے انکار کر دیا۔

اسی اثناء میں ایک چمکدار ہلکے نیلے رنگ کی گاڑی کو اپنے پاس رکتے دیکھا۔ جھانکا تو معلوم ہوا کہ بالے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہاتھ کے اشارے کر رہا تھا۔ میں نے فوراً ذکاءالدین کی طرف دیکھا۔ انہوں نے بھی شاید بالے کو دیکھ لیا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ انہوں نے جھٹ سے اگلی نشست کا دروازہ کھولا اور دھم سے حسب عادت بیٹھ کر اپنی سانس درست کرنے لگے۔ جب میں نے آناً فاناً یہ ہوتے دیکھا تو ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا۔ کیوں نہ میں بھاگ لوں۔ لیکن راستے مسدود تھے لہٰذا ارادہ ملتوی کیا اور پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

''شاعر صاحب'' بالے ہمیشہ مجھے شاعر صاحب کہہ کر پکارتا تھا۔ ''میں نے سوچا کہ آپ کو دیر ہوئی ہے تو کیوں نہ میں خود حاضر ہو جاؤں۔ یہ سوچ کر دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ آپ نکل چکے ہیں۔ میں نے آپ دونوں کو سیڑھیوں سے ہی دیکھ لیا تھا کہ آپ کی گاڑی کا دروازہ نہیں کھل رہا ہے۔ چنانچہ اپنی گاڑی نکال لایا ہوں۔''

میں نے اسے خاموش کرنے کیلئے ذکاءالدین کی طرف اشارہ کیا تو وہ کہنے لگا:

''ہاں جی میں ذکاءالدین صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ہمارے مہربان ہیں۔ مشتری بائی کے اشعار کی اصلاح فرماتے تھے اور اس کے کوٹھے پر ملاقات بھی ہو چکی ہے۔ بہت اچھے انسان ہیں۔''

یہ خبر میرے لئے ایک دھماکہ سے کم نہ تھی۔ لیکن میں نے کوئی ردِّعمل ظاہر نہ

کیا۔لیکن ذکاء الدین نے راز افشا ہوتے ہوئے خفت مٹانے کے انداز میں ایک زوردار دھپہ بالے کے کندھے پر مارا اور کہا:

''اپنے شاعر صاحب بھی کچھ کم نہیں ہیں'' ان کا اشارہ میری طرف تھا۔ ''لیکن اپنی ملاقاتیں خفیہ رکھتے ہیں۔ وہ تو اتفاق سے انہوں نے تمہارا نام لیا تو میں نے سوچا آج پرانی یادیں تازہ کرلیں۔تم سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور مشتری بائی کا حال بھی تم سے پوچھ لیں گے۔''

''ذکاءالدین صاحب، مشتری بائی کا نہ پوچھیں تو بہتر ہے'' بالے نے قدرے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا مشتری بائی کو؟'' ذکاءالدین حیرت سے بولے۔

''ذکاءالدین صاحب، یہ ایک لمبی داستان ہے پھر کسی روز آپ کو سناؤں گا۔ مختصراً وہ منوں مٹی تلے دب چکی ہے۔ میرا مطلب کہ وہ مرگئی ہے'' بالے کے چہرے پر غم کے سائے لہرا گئے۔

''لیکن کیسے؟ وہ تو کافی جوان اور صحت مند تھی'' ذکاءالدین مزید حیرت زدہ ہو گئے۔

''یہی تو بات ہے۔ جب جوان اور خوبصورت قتالہ خود قتل ہو جائے تو بہت افسوس ہوتا ہے'' بالے نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

گو کہ میں نے مشتری بائی کو کبھی نہ دیکھا تھا لیکن اس طرح سے اس کا ذکر ہوا تو میں بھی افسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔لمحہ بھر کو گاڑی میں سکوت ہو گیا۔ہم تینوں چلتی گاڑی سے سڑک پر شام کی دھند میں مدھم روشن سٹریٹ لائٹ کے قمقمے قطار در قطار گزرتے

دیکھ رہے تھے کہ نذیر ٹی سٹال آ گیا۔ مشتری بائی کے ذکر سے ماحول کسی قدر سوگوار ہو چکا تھا۔ بالے نے چائے کا آرڈر اور ساتھ ہی کچھ کھانے کے لئے کاؤنٹر پر بیٹھے نذیر سے کہہ دیا اور ہم تینوں ایک میز پر براجمان ہو گئے۔

''ہاں تو کہو بالے تمہارا کام کیسے چل رہا ہے'' ذکاء الدین نے گفتگو کی ڈور پکڑنے کی کوشش کی۔

''ذکاءالدین صاحب، کیا بتاؤں۔ مشتری بائی کے مرنے کے بعد اب کام میں جی نہیں لگتا۔ یہ سمجھو کہ میں تقریباً اس کام سے توبہ کر چکا ہوں۔ اب مجھے ہر لڑکی مشتری بائی لگتی ہے۔ کیا شریف النفس عورت تھی۔''

''طوائف اور شریف؟'' ذکاء الدین نے استفہامیہ انداز اختیار کیا۔ ''دونوں ایک ساتھ کیسے''

''ذکاء الدین صاحب، آپ یقین کریں مشتری بائی اندر سے ایک انتہائی شریف عورت تھی۔ آج تک کسی نے اس کے اندر جھانک کر نہ دیکھا تھا۔ یہ پیشہ تو اس نے وراثت میں پایا تھا۔ اسی طرح جس طرح دنیا میں اکثر لوگ وراثت میں پیشہ قبول کرتے ہیں۔ آپ تو اس کی شاعری کی اصلاح کرتے تھے۔ کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا۔''

''ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو'' ذکاء الدین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس طرح ان لڑکیوں کا کیا بنے گا جو تم سے ہمیشہ منسلک رہی ہیں۔ انہیں تو اپنی بھوک مٹانی ہے۔''

''کس کی؟'' بالے نے مسکرا کر پوچھا۔ ''اپنی یا اپنے گاہکوں کی۔''

پھر کہا''ہاں کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔لیکن حالات نے یہاں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔''

اتنے میں چائے آ گئی تھی۔ میں نے ایک کپ کو سرکا کر نزدیک کرلیا۔ بھاپ اٹھتی چائے کے کپ پر نظر جمائے بالے کی باتوں پر چشم تصوّر میں اپنے گاہکوں سے دور ہوتی ان لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔

''شاعر صاحب، آج آپ خاموش ہیں'' بالے نے میری طرف کیک کا ٹکڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ اس معاملے میں بدنصیب کون ہے۔تم یا تمہاری لڑکیاں یا وہ گاہک جو اپنی بھوک مٹانے اس بازار میں چلے آتے ہیں۔''

میری فلسفیانہ گفتگو شاید بالے تو نہ سمجھ سکا لیکن ذکاءالدین نے فوراً ٹوکا۔

''چلو تم آگے بڑھو اور کسی ایک کی بدنصیبی ختم کردو۔ارے شاعر صاحب۔اس دنیا کا نظام اسی طرح چلتا ہے۔''

ہم سب بیک وقت خوش نصیبی اور بدقسمتی کے طوفان میں گھرے اپنی اپنی ذات کو ڈھونڈھ رہے ہوتے ہیں۔''

''یہ تو آپ نے ٹھیک کہا ہے'' بالے نے ذکاءالدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اسی طرح طوفان میں گھری مشتری بائی اپنے ہاتھوں سے جان ہار بیٹھی۔''

''تم نے ابھی کہا ہے کہ وہ قتل کردی گئی ہے اور اب تم کچھ اور کہہ رہے ہو۔''

ذکاءالدین کے چہرے پر سوالیہ نشان دیکھ کر بالے قدرے گھبرا سا گیا۔

''ذکاءالدین صاحب، سچ پوچھئے تو اس نے خودکشی کی ہے نہ وہ قتل ہوئی ہے۔''

''یہ صرف مقدر نے اس کے ساتھ کھیل کھیلا ہے۔ یہ صرف میں جانتا ہوں یا وہ قاتل۔'' بالے کو سچ بتانا پڑا۔

''اب میں آپ کو تمام واقعہ سنا دیتا ہوں اور فیصلہ آپ کریں'' بالے نے ہلکی سی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

سچ تو یہ ہے کہ مشتری بائی سے انور نامی ایک شخص محبت کا بہت بڑا دعویدار تھا۔ مشتری بھی اس پر جان دیتی تھی۔ دونوں بظاہر شادی کے خواہش مند تھے۔ کیونکہ مشتری عزت کی زندگی گزارنے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ میں نے کہا نا آپ سے کہ وہ اندر سے ایک شریف النفس عورت تھی۔ لیکن اس کے گھر والے میرا مطلب کہ اس کی ماں یہ سنہری چڑیا اپنے ہاتھ سے اڑانے پر تیار نہ تھی۔ مشتری کی ماں نے مجھے بھی تمام حالات بتائے اور میری مدد کی درخواست کی تھی۔ میں اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن کیا کرتا اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ کیونکہ میں بھی مشتری سے محبت کرتا تھا لیکن اس سے شادی نہ کرسکتا تھا۔ میں بازار کے اصولوں سے وقف تھا۔ میں ایسا کرتا تو قتل کر دیا جاتا۔

یہ سوچ کر میں ایک دن مشتری کو سمجھانے کی غرض سے باہر لے گیا۔ اور راستے بھر اس کو سمجھاتا رہا لیکن مشتری کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ یہ وہی دن تھا جب میں نے بھی اپنا حالِ دل اسے کہہ ڈالا۔ لیکن مشتری کے دل پر تو انور کا راج تھا۔ وہ کسی قیمت پر اسے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ لیکن ایک عجیب بات اس دن ہوئی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں تو اس نے مجھ سے قسم لی کہ اگر تمہاری محبت سچی ہے تو تم میرا ایک کام کرو۔ میں نے جذبات کی رو میں کہہ دیا کہ میں تو تمہارے لئے جان بھی

دے سکتا ہوں۔ تو وہ بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی کہ تم اپنی گاڑی لے کر اگلے جمعہ کی صبح گھر آ جانا میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اور پھر ہم بعد میں سوچیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔

ہم دونوں بڑے انہماک سے بالے کو دیکھ رہے تھے۔ بالے کے چہرے پر کرب اور افسوس کے سائے ظاہر تھے۔ لیکن ملال کسی طرح نہ تھا۔

چونکہ معاملہ دلچسپ بھی تھا۔ ذکاءالدین نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا:

''پھر تم گئے۔''

''ہاں جناب، میں وعدہ کر چکا تھا'' بالے نے کہا۔

میں اب پوری توجہ سے کہانی کے اگلے موڑ کا انتظار کر رہا تھا کہ بالے نے کہنا شروع کیا:

''میں جب اگلے جمعہ کی صبح اس کے ہاں پہنچا تو مشتری تیار تھی۔ ایک چھوٹا سا بیگ اس کے ہاتھ میں تھا جس میں شاید اس کے زیور اور کیش وغیرہ تھا۔''

''شاعر صاحب'' اس نے پہلی دفعہ مجھے براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا ''جب وہ میرے سامنے آئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر خوبصورت تھی۔ نکھری نکھری سی بغیر میک اپ کے۔ میں تو اسے ہمیشہ رات کے گہرے سایوں میں میک اپ کئے مدھم روشنی میں دیکھتا تھا۔ دن میں کبھی اتفاق ہی نہ ہوا تھا۔ شاعر صاحب، وہ ملکہ تھی ملکہ۔ آپ یقین کریں۔''۔

میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہونے لگا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ بٹھایا اور چل پڑے۔ مشتری نے مجھے بتایا کہ ہمیں پہلے گول قبرستان جانا ہے۔ میں چونکا کہ گول

قبرستان؟ لیکن میں سرشاری میں کچھ بول نہ سکا۔ سوچا کہ شاید میرے ساتھ جانے سے پہلے اپنے کسی جدِّ امجد کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتی ہے۔''

ابھی ہم قبرستان کے دروازے پر ہی تھے کہ مجھے انور نظر آیا۔ میں نے مشتری کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائی اور رکنے کو کہنا۔ میں نے گاڑی روک لی۔ انور تیز قدموں سے چلتا ہوا گاڑی کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے یوں لگا کہ اسے پہلے سے معلوم تھا کہ ہم قبرستان آئیں گے۔

میں نے ساتھ بیٹھی مشتری کی طرف دیکھا۔ مشتری مسکرائی اور کہنے لگی ''ہاں، بالے۔ میں نے انور کو بلایا ہے'' مشتری کے چہرے پر اتنی رونق اور خوشی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں حیران تھا کہ مشتری میرے ساتھ بھاگ رہی ہے یا انور کے ساتھ۔ اتنی دیر میں انور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ میرے لئے یہ کچھ غیر متوقع تھا لیکن میں خاموش رہا۔ انور نے اندر بیٹھتے ہی سگریٹ سلگائی۔

''شاعر صاحب، آپ کو پتہ ہے کہ میں سگریٹ سے نفرت کرتا ہوں۔ اکثر آپ کو بھی منع کرتا رہا ہوں۔ آدمی دنیا بھر کے کام کرے لیکن سگریٹ نہ پیئے تو سمجھے بخشا گیا ہے۔'' یہ اس کی ایک عجیب منطق تھی جو مجھے کبھی سمجھ میں نہ آئی۔ بہر حال اس بات پر میں نے اپنی سگریٹ سلگائی اور بالے کو اپنا بیان جاری رکھنے کو کہا۔

''ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ یہ میری انور سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔'' بالے نے وہیں سے بات دوبارہ شروع کر دی۔ گاڑی میں چند لمحے سکوت طاری رہا۔ پھر مشتری نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور محبت سے بولی ''بالے تم نے اپنی محبت ثابت کر دی ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں اور ساری عمر تمہیں یاد رکھوں گی۔ ایک محسن

کی طرح تم نے میری عزت......''انور شاید جلدی میں تھا۔اس نے مشتری کی بات کاٹ دی اور پوچھا کیا تم وہ بیگ لے آئی ہو؟

ہاں، یہ رہا۔ یہ کہہ کر مشتری نے اپنی گود سے بیگ اٹھا کر انور کو پیچھے دے دیا۔

''شاعر صاحب، یہ وہ پہلا لمحہ تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ انور کس قماش کا آدمی ہے۔آپ سمجھتے ہیں نا۔''

میں نے مشتری کو متنبہ کرنے کیلیئے اشارہ کیا کہ وہ گاڑی سے باہر میری ایک بات سن لے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مشتری اپنی اندھی محبت میں ماری جائے۔ میں اس سے سچی محبت کرتا تھااوراس کا مددگار بھی تھا۔

انور نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن خاموش رہا۔ اتنے میں مشتری بولی''بالے،فکر نہ کرو، انور اپنا ہے جو کچھ کہنا ہے یہیں کہہ دو۔لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ انور کے سامنے نہ کہہ سکتا تھا۔ مجھے اس کی نیت کا فتور نظر آ گیا تھا۔ بازار میں رہتے ہوئے بازار کے دام معلوم رکھتا تھا۔انور بھی کچھ سمجھ سا گیا تھا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔''

اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے مشتری سے کہا کہ چلو نیچے اترو۔ ہم خود چلے جائیں گے۔

بس شاعر صاحب، یہ دوسرا لمحہ تھا کہ میں مشتری کو یوں لٹتے اور برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے فوراً اپنی جیب سے بھرا ہوا پستول نکالا جو احتیاطاً اپنے ساتھ رکھتا تھا اور میں نے انور سے کہا کہ وہ مشتری کا بیگ واپس کرے اور گاڑی سے اتر جائے۔

بالے نے قدرے میری طرف جھکتے ہوئے افسوس سے کہا۔

میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مشتری گھبرا گئی۔ لیکن انور میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر بالکل نہ گھبرایا۔ اس نے بڑھ کر پیچھے بیٹھے ہوئے ہی اپنے مضبوط بازو سے میری گردن دبوچ لی۔ میرا سانس رکنے لگا۔ مشتری چلائی اور اس نے انور سے مجھے چھوڑنے کو کہا۔ لیکن انور پر دولت کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ احساسِ جرم اور اس کے افشا ہونے پر اس کے اندر اتنی طاقت آ گئی تھی کہ کوشش کے باوجود میں اپنی گردن نہ چھڑا سکا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ ایک ہاتھ سے وہ میری گردن دبوچے دوسرے ہاتھ سے مجھے گھونسے مار رہا تھا۔ میں شدید مزاحمت تو کر رہا تھا لیکن میں اس کے پیچھے سے حملے میں پوری طرح گرفت میں آ چکا تھا۔

اسی اثناء میں مشتری نے اچانک میرے پستول والے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر اپنے سینہ پر رکھ لیا اور چِلّا کر انور سے کہا کہ وہ مجھے چھوڑ دے ورنہ وہ اپنے آپ پر گولی چلا دے گی۔

انور نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا ''مجھے تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہے۔''

شاعر صاحب، یہی وہ آخری لمحہ تھا جب خوش قسمتی اور بدنصیبی کے طوفان میں بدبختی نے سر اٹھا لیا تھا۔

مشتری انور کی زبان سے محبت کی یہ تذلیل نہ دیکھ سکی اور اس نے ٹریگر دبا دیا۔ گولی سیدھے اس کے سینے میں اتر گئی اور خون کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا۔ یہ کہہ کر بالے خاموش ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا:

مشتری نے پولیس کے سامنے اپنے نزعی بیان میں مجھے بچا لیا تھا۔ انور جیل میں زیورات چھیننے اور ارادہ قتل کے الزام کا سامنا کر رہا ہے۔ اور اب آپ ہی کہیے کہ یہ خودکشی ہے یا قتل۔ بدنصیبی ہے یا خوش قسمتی۔

آگہی

سال پہلے سب کچھ ٹھیک تھا۔ دست و بازو توانا، ذہن خالصتاً ہمہ تن بگوش بکار خاص و عام۔ دل گرفتگی سے آزاد مسکراتا ہوا ہواؤں کے دوش پر۔ آتے جاتے دوستوں پر فقرے کسنا اور پھر کھلکھلا کر قہقہے لگانا یوں لازم تھا کہ جیسے جھیل کے شفاف پانی کی سطح پر کنول کا پھول اپنی مسکان لئے لہروں کے دوش پر تیرتا ہوا بادِ صبا کی خوشبو پھیلاتے ہوئے کبھی رکتا نہیں۔

میں ان دنوں ایک دور افتادہ گاؤں کے اسکول میں پرائمری استاد تھا۔ بچوں کی محبت مجھے کبھی تنہا نہیں رہنے دیتی اور اسی لئے ماسٹرز کرنے کے بعد بچوں کے اس ماڈل اسکول کا انتخاب کیا۔ میری اسی محبت کرنے کی عادت نے مجھے سارے بچوں میں اور تو اور سارے گاؤں میں مقبول کر دیا ہے۔ پھر ایک دن آشا سامنے آئی اور میں

سب کچھ بھول گیا۔ آشا کا گول مٹول چہرہ اور ہرنی جیسی آنکھیں، اس کے لمبے سنہری بال، اس کی مخروطی انگلیاں اور سفید و گلابی رنگت نے مجھے اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا۔ میں اپنے خوابوں میں اپنی آشا کو مکمل ہوتے دیکھتا اور اپنی قسمت پر نازل ہوتا۔ اور پھر ایک سے دو اور دو سے تین ہوتے ہوئے نہال ہوتا اور قدرت کا شکر گزار ہوتا۔

پھر زندگی کی کتاب نے ورق الٹا۔

اس دن اسکول کی چھٹی تھی۔ میں صبح جلدی جاگ گیا تھا لیکن لیٹا رہا لیکن پھر نہ جانے کیوں میں بستر پر کسل مندی کے بے رحم ہاتھوں سے بدن چھڑا کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور تازہ ہوا کے لئے گاؤں کی مشرقی سمت دریا کی جانب چل نکلا۔ کنارے پر ستانے کے لئے رکا تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ چند لوگ ایک شخص کو مارنے کی خاطر اسے بار بار دریا میں ڈبو رہے تھے لیکن وہ شخص ان تین آدمیوں سے اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے تاہم کامیاب نہیں ہو رہا ہے۔ میں فوراً آگے بڑھا تو دیکھا وہ شخص جسے ڈبویا جا رہا ہے وہ میں ہی ہوں اور وہ تین شخص مجھے دیکھتے ہی غائب ہو گئے۔ میں اور آگے بڑھا تو میرے ہمزاد نے مجھے دور رک جانے کو کہا اور بولا: اچھا ہوا تو آ گئے ورنہ انہوں نے تو مجھے مار دینا تھا۔ میں نے ہمت کر کے پوچھا یہ لوگ کون تھے؟ میرے ہمزاد نے کہا ایک میری آشا تھی، ایک میرا بیٹا تھا اور تیسرا میرا دولت کا انبار تھا۔ میں نے اور ہمت کی اور پوچھا تم کون ہو۔ تو اس نے جواب دیا: میں تمہارا مستقبل ہوں۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔ وہ دن گزرے آج سال ہو چلا ہے میں بستر آرزو پہ ہوں اور اپنے مستقبل کو کوس رہا ہوں جس نے مجھے آگہی دے کر مجھ سے میرا شاندار خواب چھین لیا ہے۔

ستار بھائی

رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ کہیں دور نیچے سڑک پر کبھی کبھار آٹو رکشا کی پھٹی پھٹی سی آواز جب فضا میں گونجتی تو ستار بھائی پہلو بدل لیتا۔ لامو پلازہ کے چوتھے فلور پر گہرا سکوت طاری تھا۔ اب تھوڑی ہی دیر میں چاروں طرف اذانوں کی آوازیں آنا شروع ہو جائیں گی۔ ساری رات یوں جاگ کر گزر گئی تھی لیکن ستار بھائی کی آنکھوں میں نیند تو جیسے کوسوں دور تھی۔ خیالات کی بھرمار نے دماغ کو مسلسل جکڑ رکھا تھا۔ کبھی چشم تصوّر میں ستار بھائی اپنی بیٹی کشور کو دلہن بنے دیکھتا اور موسیقی کی مدھم دھنوں میں اسے بابل کے آنگن سے وداع کرتا، کبھی بھاگ بھاگ کر اپنی بیوی شکوراں کا ہاتھ بٹاتا اور کبھی صوفہ پر بیٹھے نکاح کے بعد رسموں کی ادائیگی اور دلھا کی کلائی پر گھڑی باندھتا اور کبھی بارات کے کھانے کے اخراجات کا تخمینہ لگاتا اور انگلیوں پر

حساب کرتے ہوئے چپکے سے غفار بھائی جو بچپن سے ستار بھائی کے ساتھ دوستی نبھا رہے تھے، کے کان میں رقم بتاتا اور جواباً غفار بھائی حسب عادت اپنا بڑا سا سر ہلا دیتے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ناموں کی مناسبت اور جسمانی قدو کاٹھ سے دونوں سگے بھائی لگتے تھے۔

غفار بھائی کا خیال آتے ہی ستار بھائی اٹھ کر بستر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا اور قریب پڑی منرل واٹر کی استعمال شدہ بوتل سے گلاس میں پانی انڈیلا اور غٹا غٹ ایک سانس میں پی گیا۔کل جب ستار بھائی نے غفار بھائی سے کشور کی شادی کے سلسلے میں ادھار مانگی رقم کے بارے میں پوچھا تھا تو اس نے شام کا وعدہ کیا تھا اور پھر مغرب کے وقت آ کر ستار بھائی کو بتایا تھا کہ اس کا کام ہو گیا ہے۔اعظم گیرج والے نے ایک کام کے بدلے ستار بھائی کو بیس ہزار کی رقم دینے کا وعدہ کر لیا ہے اور شاید آج رقم مل بھی جائے گی اگر ستار بھائی نے کام کر دیا تو تب۔اور یہی ستار بھائی کی رات بھر جاگنے کی وجہ تھی۔باوجودیکہ ستار نے بہت پوچھا کہ مجھے کام کیا کرنا ہو گا تو غفار نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں وہ تو اعظم گیرج والا ہی بتائے گا اور اس نے کہا ہے کہ ستار بھائی کو بتا دینا کام میں تھوڑا خطرہ ہے تاہم کوئی مسئلہ نہیں ہے۔یہ سوچ کر ستار بھائی جسے ساری دنیا اخبار بھائی کے نام سے پکارتی ہے رات بھر پریشان رہا کہ وہ زندگی میں کوئی ایسا بھی کام کر سکتا ہے جس کا معاوضہ بیس ہزار ہو۔

طے یہ پایا تھا کہ چونکہ ستار بھائی صبح سویرے فجر کے وقت اخبار دینے نکلتا ہے اسی میں وہ تھوڑی دیر کے لئے اعظم گیرج میں رک جائے گا اور وہیں پر اس کو کام بتایا جائے گا۔

ستار بھائی اب اٹھ بیٹھا تھا لہٰذا جلدی سے ایک اور گلاس پانی کا اپنے اندر انڈیلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کام کرنے کا تجسس، پیسے ملنے کی خوشی، بیٹی کی جلد آنے والی بارات اور پھر ذہن کے کسی کونے میں انجان سا خطرہ اپنی اپنی گھنٹیاں اور موسیقی بجا کر ذہن کے اندر ایک عجیب کشمکش پیدا کر چکا تھا۔ گو ستار بھائی مضبوط اعصاب کا مالک تھا لیکن نا جانے آج کچھ اپنے اندر کمزوری محسوس کر رہا تھا۔

اس نے شکوراں کو آواز دی اور ڈیوٹی پر جانے کا اعلان کرتا ہوا بلڈنگ کی سیڑھیاں اتر کر نیچے پلازہ کے کمپاؤنڈ میں آ گیا۔ شکوراں اسے آوازیں دیتی ہی رہ گئی کہ کچھ تو صبح صبح کھاتے جاؤ لیکن اس نے ایک نہ سنی اور نیچے آ گیا۔ اس نے اپنی سائیکل جو زنجیر کے ساتھ لوہے کی سیڑھیوں سے بندھی ہوئی تھی، کو کھولا۔ اسے ہلکا سا فضا میں اچھال کر زمین پر مارا جس سے دونوں ٹائروں کی ہوا کا وزن چیک ہوا۔ سائیکل کے دونوں اطراف میں مضبوط کینوس کے لٹکے ہوئے تھیلوں کو چیک کیا اور پھر سوار ہو کر کمپاؤنڈ سے باہر آ گیا۔ اب اس کا رخ سیدھا انور پان شاپ کے قریب اخبار فروش ہاکروں کے اڈے کی طرف تھا۔ چند ہی منٹ میں وہ وہاں پہنچ گیا تھا۔

صبح صادق کی پہلی روشنی افق کے پار مشرق میں جلوہ گر ہو رہی تھی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی اور بادِ صبا کا احساس تھا۔ گو سڑکیں ویران تھیں لیکن اِکا دُکا گاڑی، موٹر سائیکل یا آٹو رکشا چل رہے تھے۔ بھانت بھانت کی بولیوں والے ہاکروں کے درمیان الجھا ہوا اخبار بھائی آج سب کو اداس دکھائی دے رہا تھا۔ ستار بھائی نے اپنے حصّے کے اخبار خاموشی سے اٹھائے، انہیں ترتیب سے کینوس کے تھیلوں میں ڈالا اور سب کو سلام کرتا ہوا نکل کھڑا ہوا۔ ہاں نکلنے سے پہلے وہ اخبار کی سرخیوں کو دیکھنا اور مولا پتی

والے سے پان لینا نہ بھولا تھا۔ منہ میں دن کی پہلی گلوری دباتے ہوئے اپنے سفر کے آغاز میں پہلی گلی میں مڑتے ہوئے جب اس نے اپنی روزمرہ آواز میں ہانک لگائی
''آج کا تاجاہ اخبار.... شہر میں دن دہاڑے ڈاکٹر اپنی جان ہار بیٹھا، جالم دہشت گردوں نے لیڈی ڈاکٹر کی جان لے لی.... آج کا تاجاہ اخبار''....

اور اس کے ساتھ ہی ہینڈل پر بندھا اپنا مخصوص باجا بجایا تو نہ ہی اس کی اپنی آواز میں کوئی جادو بولا اور نہ ہی باجے نے اپنی دھن میں جان ڈالی۔ یوں لگا کہ باجا بھی اپنے مالک اخبار بھائی کے ساتھ ہی گم سم ہے۔

ایک گلی سے دوسری، ایک پلازہ سے دوسرا اور یوں ہانک لگاتا ہوا اور اخبار گھروں میں پھینکتا ہوا ستار بھائی ایک گھنٹہ بعد اعظم گیرج میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنی سائیکل دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑی کی اور بلیوں اچھلتے دل کو قابو کرتے ہوئے اعظم مستری کو آواز لگائی۔ اعظم مستری پہلے ہی اس کی باجے کی آواز سن چکا تھا اور اندر کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ انہیں وہیں چھوڑ کر اعظم مستری باہر نکلا۔

''ارے ستار بھائی اندر آجاؤ''

اور پھر وہ ستار بھائی کو لے کر ایک اور کمرے میں لے گیا۔

''دیکھو.... ستار بھائی کام بہت آسان ہے لیکن شرط بہت مشکل ہے۔''

''ارے آجم بھائی، ہم لوگ اخبار بیچتا ہے۔ کوئی کام سالا مشکل نائیں ہوتا ہے، تم بولو۔ اپن کو کیا کرنا ہے۔''

''ہاں ہاں! تبھی تو میں نے غفار بھائی کو بولا کہ یہ کام صرف اخبار بھائی ہی کر سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ کام خفیہ ہے معلوم نہ پڑے کہ کس نے کیا؟''

پھر مسکراتے ہوئے اعظم نے جیب سے سوسو کے نوٹوں کے دو پیکٹ نکالے اور ستار بھائی کی طرف بڑھا دیئے۔

''ستار بھائی، لواسے رکھ لو، تمہاری بیٹی کی شادی ہے نا، یہ اس کے لئے ہے۔''

نوٹوں کو دیکھ کر ستار بھائی کی آنکھیں پھیل گئیں اور چہرہ تمتما اٹھا لیکن ساتھ ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدلے اور ستار بھائی نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا:

''ارے آجم بھائی کوئی لفڑا والا کام ہم نہیں کرے گا۔ دیکھو ہم نے ساری جندگی ایمان کے ساتھ گجاری ہے۔''

''ستار بھائی۔ ایسا نہیں ہے بھائی۔ کام یہ ہے کہ میں تمہیں ایک پیکٹ دوں گا جو تم نے آج جانکی بالا گرلز سکول کے دفتر میں اخبار ڈالتے ہوئے اسے بھی کہیں ساتھ میں رکھ دینا ہے۔ چھوٹا سا پیکٹ ہوگا۔''

''ارے آجم بھائی کوئی بم وم تو نہیں؟''

''ستار بھائی چھوڑو ان باتوں کو۔ بولو رکھنے کا ہے یا میں کسی اور کو بولوں.... تم کو بیس ہزار ایسے تو نہیں دینے لگے۔'' اعظم نے اپنی بات میں وزن لانے کے لئے یونہی نفسیاتی دباؤ ڈالا۔ ستار نے چشمِ تصوّر میں کشور کے مہندی لگے ہاتھوں کی طرف دیکھا پھر اس کی ماں شکوراں کا چہرہ اپنی زندگی کی تمام تر محرومیاں لئے سامنے آ گیا جو دامن پھیلائے ستار سے کچھ مانگ رہی تھی۔

''آجم بھائی یہ سالا جانکی بالا سکول وہی تو ہے نا جو جمبو پلازہ کے پیچھے ہے؟ ستار نے گویا حامی بھر لی۔

''ہاں.... ہاں وہی ہے'' اعظم جوش سے بولا۔

’’ارے ہم جانتا ہے اسی سالا سکول میں میرا بیٹی کشور دس سال پڑھا ہے وہ تو اب اس کی شادی ہے ورنہ اس کو اپن کالج میں ڈالتا‘‘ یہ کہتے ہوئے ستار بھائی نے گویا مہر ثبت کر دی اور اسی کے ساتھ ہی نوٹ اس نے اپنے سلوکے میں رکھ لئے۔

’’لاؤ وہ پیکٹ کہاں ہے؟‘‘

’’ہاں یہ رہا‘‘ یہ کہہ کر اعظم نے کونے سے ایک ڈبہ نما چیز اٹھائی اور ستار بھائی کو دیتے ہوئے کہا’’بس ستار بھائی جب اسے وہاں رکھیو تو یہ بٹن دبا دینا‘‘ اعظم نے بٹن کو سامنے کرتے ہوئے ستار بھائی کو دکھا دیا۔

’’ایک بات اور ستار بھائی تم آٹھ بجے اسے رکھ دینا....نہ پہلے نہ بعد میں....‘‘

’’ارے ٹھیک اے، ٹھیک اے بھائی۔ دیکھ بھی لیا اور سن بھی لیا۔ اب کیا میں جاؤں‘‘ ستار گویا جلدی میں آ گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اب یہاں سے جلد از جلد نکل جائے۔

’’ستار بھائی ہاں ٹھیک ہے، اب تم جاؤ‘‘ اعظم نے خوشدلی سے کہا۔ ستار جب باہر نکلنے لگا تو پیچھے سے اعظم بولا....’’ستار بھائی اب سات بجنے والے ہیں۔ ٹھیک آٹھ بجے آگے نہ کم۔‘‘

باہر نکلتے ہی ستار بھائی نے خوشی سے سائیکل کو جھولاتے ہوئے پیڈل کو اپنی پوری قوت سے گھمایا اور اس کی رفتار تیز کر دی۔ کافی دور جانے کے بعد اس نے اپنی ہانک لگائی’’آج کا تاجہ اخبار....‘‘ لیکن اسے یوں لگا کہ آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ وہ پھر بولا’’آج کا تاجہ اخبار....‘‘

لیکن یہ کیا ہوا....یہ اپن کو....سالا کیا ہوا....آواز کہاں گیا؟ ستار خود بخود منہ

میں بڑبڑایا۔ وہ بیک وقت خوشی اور خوف کے سایہ میں گھرا ایک انجانی سی کیفیت میں مبتلا ہو چکا تھا۔

اس نے اپنی پوری طاقت کو استعمال کرتے ہوئے پھر ہانک لگائی.... ''آج کا تاجاہ اخبار''.... اسے لگا کر آواز کسی کنویں میں سے آرہی ہے۔ منحنی سی اور باریک....

ستار بھائی نے اپنی سائیکل کو بریک لگائے اور ایک طرف سایہ میں کھڑے ہوتے ہوئے جیب سے نکال کر ایک تازہ گلوری منہ میں دبائی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا لیکن وہ اپنے پورے حواس میں تھا۔ یہ احساس کہ وہ ایک جیتا جاگتا بم ساتھ لئے گھوم رہا ہے، کافی تھا۔

اس کا دل ایک طرف خوشیوں کے شادیانے سن رہا تھا دوسری طرف دماغ بم کا بوجھ اٹھائے اس کی ٹک ٹک کی آواز سے بھاری ہو رہا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس بم کی پن ابھی دبائی نہیں گئی ہے۔ خوف کی ایک سرد لہر آہستہ آہستہ اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی جو رفتہ رفتہ اسے ایک انجان سی استکراہی کیفیت میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس کا دل متلا رہا تھا۔ اسے آنکھوں کے سامنے سینکڑوں بچیاں سفید کفن اوڑھے قطار در قطار زمین پر لیٹی نظر آئیں۔

یہ دیکھ کر ستار بھائی کا دل باہر آ گیا۔ اسے شدت سے چائے کی طلب محسوس ہوئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور یہ سوچ کر اس نے نظر آنے والی پہلی سڑک کراس پر چائے کی دوکان کی طرف سائیکل موڑ دی۔ قریب جا کر اس نے سائیکل کو ایک درخت کے ساتھ ایستادہ کیا اور ساتھ پڑی بنچ پر بیٹھ کر آواز لگائی:

''بھائی، ایک چائے تیز پتی'' چائے والے نے ستار بھائی کو پہچان لیا تھا۔

ارے چھتار بھائی.... کیوں چہرہ چھبید ہے، ارے طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

’’ہاں.... ہاں یار تو جلدی سے چائے لا اور سن، کَے بجے ہیں؟

چھتار بھائی سات سے اوپر ہے۔ یہ کہہ کر اس نے چائے ستار کی طرف بڑھا دی۔ ابھی ستار بھائی نے پہلی چسکی ہی لی تھی کہ قریب میں گشت پر مامور پولیس کی موبائل کار آ کر رکی۔ موبائل کار کا کیا رکنا تھا کہ ستار بھائی کے قدموں تلے زمین سرک گئی۔ ایک انجانے خوف کی لہر جو پہلے ہی اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اب نئی توانائی کے ساتھ ابھر کر اس کے کندھوں میں اینٹھن کی شکل میں آ گئی۔ ستار بھائی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس کے جسم پر ہلکی سی کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے چائے کے کپ کو منہ تک لے جانے کی کوشش کی اور اسی میں چائے اس کے کپ سے چھلک کر کپڑوں پر گر گئی۔ ایک پولیس کانسٹیبل اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چائے کے گرنے پر وہ کچھ مسکرایا۔ جواباً ستار بھائی نے اپنی ہمت کو یکجا کرتے ہوئے کانسٹیبل کی آنکھوں میں جھانکا اور مسکرا دیا۔ اور کھڑا ہو کر اپنی قمیص پر سے چائے کو ہاتھ سے جھاڑنے لگا۔

کانسٹیبل کی آواز پر چائے والے نے دو کپ ان کی طرف بڑھا دیئے۔ کانسٹیبل نے ایک کپ ہاتھ میں تھاما دوسرا اپنے ساتھی کو دیتے ہوئے ستار بھائی کی سائیکل کی طرف چل پڑا۔ ستار بھائی اسے اپنی سائیکل کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا لیکن خاموش رہا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً یہاں سے بھاگ نکلے۔ بم پکڑے جانے کے خوف سے اس کے دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے آپ کو یوں بے بس محسوس کیا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بری طرح جال میں

پھنس چکا ہے۔

کانسٹیبل نے کینوس کے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک اخبار نکالا اور اسے دیکھنے لگا۔ دوسرے نے آواز لگائی ارے سیدھا تو کر لے سالے تو کیا اخبار پڑھے گا۔

ستار بھائی نے موقع غنیمت جانا۔ جھٹ سے کپ بنچ پر رکھا اور ہوٹل والے کو یہ آواز لگاتے ہوئے کہ پیسے بعد میں دوں گا اپنی سائیکل سیدھی کی، اپنے حواس پر قابو پایا اور سرعت سے سڑک پر نکل آیا۔ وہ ایک فیصلہ کر چکا تھا اور اب اطمینان اس کے چہرے پر نمایاں تھا۔

اس نے ہانک لگائی ....''آج کا تاجاہ اخبار ....''اس دفعہ اس کی آواز پُرجوش اور کڑک دار تھی۔ اور اُس کا رخ اعظم گیرج کی طرف تھا۔

''آج کا تاجاہ اخبار.... جالم دہشت گرد نے آجم گیرج اڑا دیا.... آج کا تاجاہ اخبار۔''

فطرت

شیخ حسام الدین گویا یوں ہڑبڑا کر اٹھے جیسے یومِ محشر آن پہنچا ہے اور صور اسرافیل پھونکنے پر انسان اپنی اپنی جگہ پر دوبارہ زندہ ہو چلے ہیں۔ آنکھیں ملتے ہوئے انہوں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ کہاں ہیں۔ جونہی ان کے خوابیدہ حواس بحال ہوئے تو انہیں یاد آیا وہ تو صوفہ پر ہی لیٹ گئے تھے اور پھر اچانک کب آنکھ لگ گئی، انہیں معلوم نہ تھا۔

دروازے کی گھنٹی جب دوبارہ بجی تو انہیں احساس ہوا کہ اوہ.... یہ تو گھنٹی کی آواز تھی جسے وہ نیند میں صور اسرافیل سمجھ بیٹھے تھے۔ چپل پہنتے ہوئے وہ صوفہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور منہ میں بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی طرف چل پڑے۔

''نہ جانے کون کون چلا آتا ہے یہاں بلا روک ٹوک''

دروازہ کھولا تو سامنے آسیہ کھڑی تھی۔ لمبا قد اور گدرائے ہوئے بدن پر میلی کچیلی شلوار قمیص اور مٹی میں اَٹی ہوئی چپل پہنے سانولی بلکہ تقریباً کالی رنگت میں بھی آسیہ ایک دلکش اور مدھر گیت کی طرح شیخ صاحب کے حواس پر پہلے ہی سوار تھی۔ لیکن حسبِ معمول انہوں نے اسے دیکھتے ہی منہ بنایا اور حتی الامکان چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولے:

''ارے تم اس وقت۔ باجی تو گھر پر نہیں ہیں''

وہ اپنی بیگم کو باجی پکار کر آسیہ سے برابری کے رشتے کو استوار کرنے کی لاشعوری کوشش میں تھے۔ جبکہ آسیہ کم و بیش ان سے تیس سال تو چھوٹی ہوگی۔ وہ شیخ حسام الدین کے ہاں گزشتہ دو سال سے کام کر رہی تھی اور گھر کی صفائی ستھرائی سے لے کر بیگم کے جسمانی مساج تک کے تمام امور اسی کے سپرد تھے۔ جب سے شیخ صاحب ریٹائر ہو کر گھر کے ہو رہے تھے تب سے وہ آتے جاتے آسیہ سے کبھی اس کے شوہر کے بارے میں سوالات کرتے اور کبھی چرچ میں خود بخود حاضر ہونے کی نوید سناتے۔ آسیہ اکثر ان کے سوالات پر ہوں ہاں کر دیتی تو بیگم کا پارہ چڑھ جاتا اور وہ طنزیہ انداز میں شیخ صاحب سے کہتیں:

''اچھا جب آپ کو اس کا اتنا خیال ہے تو اسے کبھی کچھ دے بھی دیا کرو''

تب شیخ صاحب جھینپتے ہوئے کچھ روپیہ آسیہ کو دے دیا کرتے۔ وہ الگ بات ہے کہ بعد میں وہ بیگم سے شکایت کرتے:

''ارے تمہیں معلوم نہیں کہ کرسچین کو زکوٰۃ وغیرہ نہیں دینی چاہئے، قبول نہیں ہوتی۔''

تو بیگم جواباً جھلا کر بولتیں:

''کمال کرتے ہو تم بھی شیخ حسام الدین۔ کبھی انسانیت کے ناطے بھی سوچ لیا کرو۔ تمھیں ریٹائر ہوئے ایک سال ہو گیا ہے لیکن تمھاری سوچ وہی سرکاری دفترانہ ہی رہی۔ غریب اور وہ بھی آپ کا گھریلو ملازم۔ ان کا خیال رکھنا ہمارا دینی اور معاشرتی فرض ہے۔''

''تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم اس کا خیال نہ رکھو۔ لیکن بیگم خدا لگتی کہو سارا دن تم اسے کوہلو کے بیل کی طرح ہانکتی ہو اور پھر تھوڑی سی تنخواہ پر اسے ٹرخا دیتی ہو۔''

''تمھیں کیا معلوم میں اس کا کتنا خیال رکھتی ہوں''۔ بیگم گویا جان چھڑاتے ہوئے بولتیں اور یوں یہ معاملہ گفت وشنید اپنے انجام کو پہنچتا اور آسیہ ہمیشہ کے لئے شیخ حسام الدین کی منظور نظر بننے سے محروم رہ جاتی۔ جبکہ دلی طور پر حسام الدین اکثر کنکھیوں سے اس کے جسم پر نظریں دوڑائے رکھتے اور پھر بالآخر اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی ناکامی کو رضائے الٰہی سمجھتے ہوئے اپنی انجان سی فطری خواہش پر قابو پانے کی رسید جاری کر دیتے اور یوں یہ معاملہ کسی اگلے وقت کے لئے اٹھ جاتا۔

''اچھا اگر باجی گھر پر نہیں ہیں تو میں چلتی ہوں''۔ باجی کے گھر پہ نہ ہونے پر آسیہ کے چہرے پر تاسف کا تاثر نمایاں ہو گیا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

شیخ صاحب آسیہ کے چہرے کو دیکھ کر لمحے بھر کو چکرا گئے۔ انہوں نے آسیہ سے پوچھا ''خیریت تو ہے نا؟''

''آسیہ نے تقریباً روتے ہوئے کہا کہ میں باجی سے کچھ روپیہ ادھار لینے آئی تھی''

یہ سنتے ہی شیخ صاحب کے اندر ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

''اچھا تم اندر آؤ۔ کچن کا کچھ کام پڑا ہے وہ نپٹا دو۔ جب تک میں پیسوں کا انتظام کرتا ہوں۔''

اب شیخ حسام الدین کے سامنے دو راستے تھے۔ انہیں اچانک میرزا غالب کا مصرع یاد آیا:

روکے ہے مجھے ایماں تو کھینچے ہے مجھے کفر

انہوں نے دروازے سے ہٹتے ہوئے آسیہ کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

''اچھا تم کام ختم کر لو۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔ جب کام ختم ہو جائے تو مجھے بتا دینا۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑے اور آسیہ کچن کی طرف چلی گئی۔

حسام الدین یوں تو اپنے کمرے میں آ چکے تھے اور اپنے بیڈ پر ٹیک لگائے اخبار پڑھ رہے تھے لیکن خیالات اور جذبات کے دریا اور انسانی فطری تقاضے دونوں ایک ساتھ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں گرنے کو بیتاب تھے۔

تنہائی اگر اپنے ساتھ مواقع لائے تو انسان اندر سے بے چین ہو کر فطری تقاضے پورے کرنے کو ایک تئیں عین عبادت سمجھ بیٹھتا ہے اور پھر ایک نئے راستے پر چل نکلتا ہے۔ یہی حال کچھ اس وقت شیخ حسام الدین کا تھا۔ نئے راستوں پر چلنے کی امنگ نے انہیں بے چین کر دیا تھا۔ یوں تو وہ اپنے بیڈ پر تھے لیکن دراصل وہ کچن میں آسیہ کے آس پاس ہی گھوم رہے تھے۔ اور شرف ملاقات کے کسی معقول بہانے کی تلاش میں تھے۔

پھر بھوک غالب آ گئی۔

حسام الدین نے اپنی الماری سے کچھ نوٹ نکالے اور اپنی مٹھی میں تھام لئے اور کچن کی طرف چل پڑے۔ آسیہ تقریباً اپنا کام ختم کر چکی تھی اور اپنے ہاتھ اور منہ کو دھو کر دوپٹے سے صاف کر رہی تھی۔

حسام الدین نے ایک بھرپور مردانہ نظر آسیہ پر ڈالی تو آسیہ نے خاموشی سے نظریں جھکا دیں۔

''ہاں تو آسیہ تم اس دن اپنے کسی بچے کی بیماری کی بات کر رہی تھی۔ اب وہ کیسا ہے؟''

آسیہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن پھر ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ وہ صرف شیخ صاحب ہی کہہ پائی تھی کہ اچانک وہ شیخ حسام الدین کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ یوں لگ رہا تھا کہ شدید نقاہت سے وہ نڈھال ہو چکی ہے۔

شیخ صاحب یہ سمجھے کہ بچے کی بیماری کی وجہ سے آسیہ پریشان ہے۔ لہٰذا انہوں نے تسلی دینے کے لئے کندھوں سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور اپنے سامنے کھڑا کرتے ہوئے کہنے لگے:

''تم ناحق پریشان ہو۔ لو یہ کچھ پیسے رکھ لو۔ تمہارے لئے اور تمہارے بچے کے لئے۔''

آسیہ نے آہستگی سے پیسے لئے اور شیخ صاحب کی طرف ڈبڈباتی ہوئی موٹی موٹی سفید آنکھوں سے تشکرانہ نظریں ملائیں اور رندھی ہوئی آواز میں بولی:

''شیخ صاحب آپ ولی اللہ ہیں۔ نہ جانے آپ کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔ ہماری تکلیفوں کا ہمیشہ مداوا کرتے ہیں۔ اب میرے ڈیوڈ کے کفن کا انتظام بالکل

ٹھیک ہو جائے گا۔“

اور ہچکیاں لیتے ہوئے شیخ صاحب کے ہاتھوں کو چوما اور باہر دروازے کی طرف چل پڑی۔

شیخ حسام الدین پتھر کے بت بنے اپنے قدموں پر ساکت و جامد ایستادہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

اپنی مٹی

بنجر اور پتھریلے پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا یہ چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن سہ پہر کے ڈھلتے ہوئے سایوں کی اوڑھ میں ایک عجیب سا طلسماتی منظر پیش کر رہا تھا۔ان پہاڑی علاقوں میں شام جلد ہو جایا کرتی ہے۔ یہ بات یہاں کے باسیوں کو تو معلوم تھی لیکن امبرین اور اس کا بیٹا معصومیت سے پہاڑوں پر چوٹیوں کے سائے گہرے ہوتے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

ہلکی ہلکی خنک ہوا جب ان کے کانوں میں سرسراہٹ کرتی اور گالوں کو چھوتی ہوئی گزرتی تو امبرین پلیٹ فارم کے بنچ پر بیٹھے بیٹھے ہی نوید کو اپنی بغل میں دبوچ لیتی۔

ٹرین کب سے انہیں اتار کر آگے کوئٹہ کی جانب بڑھ چکی تھی۔ سبی سے کوئی تیس کلومیٹر دور شمال مغرب میں پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا یہ چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن

اپنے نام ''آبِ گم'' کی وجہ سے کافی پُراسرار لگتا ہے۔

ادھیڑ عمر اسٹیشن ماسٹر بلوچ خان ایک دو بار خود امبرین کے پاس آ کر کہہ چکے تھے کہ جب تک ماسٹر عبداللہ نہیں آ جاتے وہ اندر آ کر ان کے کمرے میں بیٹھ جائے۔ کیونکہ شام کے سائے گہرے ہوتے ہی خنکی بہت بڑھ جائے گی اور باہر پلیٹ فارم بنچ پر بیٹھنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن امبرین نے انہیں ممنونیت سے دیکھا اور باہر کھلے میں ہی لوہے کے بنچ پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔

بلوچ خان گزشتہ کئی سالوں سے یہاں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ تعلق تو ان کا سبی کے ایک بلوچ گھرانے سے تھا لیکن اب تک غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اپنی خواہش پر آبِ گم میں بحیثیت اسٹیشن ماسٹر تعینات تھے۔ دو کمروں کا چھوٹا سرکاری کوارٹر، دو سگنل مین، ایک چوکیدار اور چند گینگ مین اور دن بھر میں صرف چار ٹرینیں دو کوئٹہ کی جانب اور دو سبی کی جانب ان کا کل سرمایہ تھا۔ دن بھر اخبار اور کتابیں پڑھنا، چند مقامی بلوچ دوستوں اور اسکول ٹیچرز کے ساتھ بلوچی احوال کرنا اور شطرنج کھیلنا ان کا مشغلہ تھا۔

یوں تو مقامی لوگوں میں آبِ گم ریلوے اسٹیشن سے منسوب طرح طرح کی کہانیاں زبان عام پر تھیں جن میں سے اکثر غیر مرئی اور ماورائی علامتوں سے بھرپور تھیں۔ بلوچ خان جب نئے نئے یہاں آئے تو یہ پُراسرار کہانیاں سن کر پہلے تو تھرّا سے گئے لیکن پھر آہستہ آہستہ انہیں یقین ہونے لگا کہ یہ سب کہانیاں تو ہم پرستی اور بیکار ذہن کی اختراع ہیں۔ ہاں البتہ انہیں اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ میرزا ہادی رسوا نے ایک صدی پہلے یقیناً یہیں بیٹھ کر اردو ادب کا معرکۃ الآراء اور لافانی ناول

امراؤ جان ادا تخلیق کیا تھا۔ اس یقین کا سبب بہرحال میرزا رسوا کا یہاں بحیثیت اسٹیشن ماسٹر کئی سالوں کا قیام اور وہ طلسماتی ماحول جو رفتہ رفتہ انسان کے اندر جذب ہوتا چلا جاتا ہے اور تخلیق کا موجب بنتا ہے۔

''بہن اندر آ جاؤ، اب سردی بڑھ رہی ہے۔'' اسٹیشن ماسٹر بلوچ خان امبرین کے قریب آ کر آہستہ سے بولے۔

''ہاں امّی ...... مجھے سردی لگ رہی ہے'' نوید نے فوراً لقمہ دیا۔ امبرین کے پاس اب کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بلوچ خان کو انکار کر سکے۔ لہٰذا نوید کو اشارہ کرتے ہوئے ہولے ہولے قدموں سے اپنا بیگ اٹھائے وہ بلوچ خان کے پیچھے چل پڑی۔

اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ اچھا خاصا بڑا ہونے کے باوجود کافی سامان سے اَٹا پڑا تھا۔ اونچی چھت لوہے کے گارڈرز پر دراز تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی دائیں طرف ایک کشادہ لکڑی کا میز اپڑا تھا جس کے پیچھے وسط میں ایک جہازی کرسی پڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ریلوے سگنل کا مواصلاتی نظام نصب تھا۔ اس کے سامنے دیوار کے ساتھ ایک جہازی سائز کا صوفہ دھرا تھا جو صوفہ سے زیادہ بستر کی مانند نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دیوار سے جڑی ایک ڈریسنگ ٹیبل تھی جس پر چائے کا سامان اور کچھ برتن پڑے تھے۔ برابر میں کھڑکی کے نیچے ایک مٹی کے تیل کا اسٹوو دھرا تھا اور عین وسط میں برطانوی دور کا چھت سے لٹکا ہوا ایک آئل لیمپ کمرے میں روشنی پھیلا رہا تھا۔

''ماسٹر عبداللہ تک میں نے پیغام تو بھیج دیا تھا، انہیں اب تک آ جانا چاہئے'' بلوچ خان اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

اسی اثناء میں امبرین اور نوید دیوار کے ساتھ لگے جہازی صوفہ پر ایک طرف

سمٹ کر بیٹھ چکے تھے۔

''تم ماسٹر عبداللہ کی رشتہ دار ہو'' بلوچ خان نے دریافت کیا۔ ''نہیں'' امبرین نے آہستگی سے کہا۔ ''وہ میرے والد کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ میرے والد بلوچستان یونیورسٹی میں استاد تھے اور ماسٹر عبداللہ ان کے شاگرد تھے۔ والد کے قتل کے بعد انہوں نے پڑھائی چھوڑ دی تھی اور ٹیچر ہو گئے تھے۔

''اوہ'' بلوچ خان نے افسوس سے کہا۔ ''مجھے تمہارے والد کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا، یہ کب کی بات ہے۔''

''یہ چند سال پہلے کی بات ہے۔ ان کے انتقال کے بعد ہم پنجاب منتقل ہو گئے تھے۔''

''بہن! ہے تو یہ ایک ذاتی سا سوال اگر تم بُرا نہ مناؤ، تم خیریت سے یہاں ماسٹر عبداللہ سے ملنے آئی ہو'' بلوچ خان نے اپنے دل میں نہ جانے کیوں درد کی ایک ہلکی سی کسک محسوس کی اور پوچھ لیا۔

ایک جوان عورت کا اپنے دس سالہ بیٹے کے ساتھ تنہا یوں بلوچستان کے ایک دورافتادہ گاؤں میں چلے آنا، بلوچ خان کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ اور پھر ماسٹر عبداللہ کے تو مقامی پُرجوش نوجوانوں سے گہرے تعلقات تھے۔ بلوچ خان نے خود کو گہرے تفکرات میں گھرا ہوا محسوس کیا۔ اسے اس لڑکی کی سلامتی نہ جانے کیوں خطرے میں نظر آئی۔ لیکن کس طرح اور کیونکر؟ یہ عقدہ ابھی حل طلب تھا۔

اچانک کمرے کی خاموش فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوا۔ باہر ویران پلیٹ فارم پر تیز قدموں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں جو لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھیں۔ پھر چند

آوازیں معدوم ہوگئیں اور صرف ایک آواز دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

بلوچ خان جھٹ سے اپنی کرسی سے اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ اتنے میں ماسٹر عبداللہ کا ہیولہ دروازے میں نمودار ہوا۔ بلوچ خان نے ایک گہری سانس لی اور ماسٹر عبداللہ سے مخاطب ہوئے:

''واللہ تم نے تو ماسٹر ڈرا دیا تھا۔ اتنی دیر لگا دی آتے آتے، آؤ بیٹھو'' یہ کہہ کر بلوچ خان خود اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔

ماسٹر عبداللہ نے پہلے تو اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور بیٹھنے کے لئے کوئی اور مناسب جگہ نہ دکھائی دینے پر خود ہی کمرے کے واحد صوفے پر دوسری طرف ایک کنارے میں سکڑ کر بیٹھ گئے۔

''واجہ.... میں دراصل مصروف تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آج امبرین بی بی آ رہی ہیں۔ انہوں نے مجھے اطلاع کر دی تھی اور آپ کا پیغام بھی مل گیا تھا۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ ان کا کام جلد از جلد ہو جائے تا کہ یہ کل صبح کی ٹرین سے واپس چلی جائیں۔ اسی لئے کچھ مصروفیت رہی۔''

بلوچ خان کے چہرے پر تفکرات کے ساتھ اب تجسس کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔

''ماسٹر صاحب کیا میں کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ معاملہ کیا ہے لیکن مجھے اتنا اندازہ ہو رہا ہے کہ کوئی سنگین بات ہے۔''

''ہاں یقیناً آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ پہلے تو یہ کہ آپ ان کے ٹھہرنے کا بندوبست کریں۔ پھر میں آپ کو تمام روئیداد سناتا ہوں۔''

''ٹھہرنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بہن پچھلی طرف میرے گھر میں اپنے بیٹے کے ساتھ ٹھہر جائیں۔ میں یہیں پڑا رہوں گا اور پھر صبح دیکھ لیں گے۔ ہاں البتہ ان کے کھانے کا پہلے بندوبست کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر بلوچ خان نے میز پر پڑا کالے رنگ کا فون اٹھایا اور اس کے ساتھ جڑا ہوا لیور زور سے گھمایا۔شاید دور کہیں کوئی گھنٹی بجی ہوگی۔ چند منٹوں میں شلوار قمیص میں ملبوس ایک نوجوان سالڑکا دروازے پر نمودار ہوا۔

''جی واجہ'' لڑکا براہوی میں بولا۔

''شاکر خان، مہمان آئے ہیں تم جلدی سے کھانے کا بندوبست کرو۔ حلیمہ سے کہنا تین چار مہمان ہیں۔''

''جی واجہ'' شاکر سر ہلاتا ہوا واپس چلا گیا۔

''ہاں، ماسٹر عبداللہ۔ اب کہو کیا معاملہ ہے'' بلوچ خان نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''بلوچ خان، آپ جانتے ہیں کہ یہاں علاقہ کے متوالے نوجوان کس طرح اپنی آواز بلند کر رہے ہیں۔ ایک طرف حکومت ہے اور اس کی نالائقی، بے حسی اور مصلحت کوشی ہے۔ دوسری طرف محرومیاں، بدگمانی اور بے اعتمادی اپنے روایتی ظالم پنجے معاشرتی زندگی میں گاڑے انتقام کی آگ کو ہوا دے رہی ہیں۔ اور اس سارے معاملے میں غریب اور مظلوم عوام کی زندگی مزید اجیرن ہوگئی ہے۔ نوجوانوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ اپنی زندگی کی باگیں خود سنبھالیں۔ گو کہ اس میں گرنے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ دانشور اور بزرگ دونوں طرف کے دباؤ کے خوف

میں خاموش ہو چکے ہیں۔ان کے خیال میں مسلسل سیاسی گراوٹ اور معاشی محرومیوں نے اب نوجوان نسل کو آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا ہے۔اب وہ رک نہیں سکتے۔''

''لیکن میں بہن امبرین کے معاملے کی بات پوچھ رہا ہوں'' بلوچ خان نے ماسٹر عبداللہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ امبرین بی بی کے شوہر یہاں ملیشیا میں تعینات تھے اور پھر ایک دن وہ جب چھٹیوں میں واپس اپنے گھر جانے کے لئے ٹرین پر سوار ہو رہے تھے کہ کسی برقع پوش شخص نے انہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ اور اپنے بیٹے کی سالگرہ پر پہنچنے والا باپ اپنے خاموش لاشے کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ یہ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔امبرین بی بی نے بڑی بہادری سے یہ دکھ جھیلا لیکن اپنے شوہر کے بے گناہ قتل کو وہ بھول نہ سکی۔ابھی تو اس کے باپ کا غم ہی کم نہ ہوا تھا۔ پھر امبرین نے مجھ سے رابطہ کیا اور مجھ سے مدد کی درخواست کی۔اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے شوہر کے قاتل کو ڈھونڈھنے میں اس کی مدد کروں۔قاتل سے یہ خود نپٹنا چاہتی ہے۔''

''تو کیا یہ مسلح ہو کر یہاں آئی ہے؟'' بلوچ خان نے اچانک سوال داغ دیا۔

''مجھے نہیں معلوم، لیکن یہ سوال آپ امبرین بی بی سے پوچھیں تو بہتر ہے۔''

''نہیں میں کوئی ایسی بات ذہن میں لے کر نہیں آئی ہوں اور نہ ہی میں مسلح ہوں۔ میں نے تو بھائی عبداللہ سے کہا تھا کہ مجھے قاتلوں تک پہنچا دو۔ میں خود ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ پھر چند روز پہلے بھائی عبداللہ نے مجھے فون کر کے بتایا کہ انہیں قاتلوں کا پتہ چل گیا ہے لہٰذا تم اگر آنا چاہو تو چلی آؤ۔اور یوں میں آج یہاں ہوں۔''

''ہاں تو ماسٹر بتاؤ کون ہیں وہ لوگ جنہوں نے امبرین کے شوہر کو قتل کیا ہے۔''

''میں دو خواتین کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔ آپ خود مل لیں اور پھر یہ عقدہ حل کریں'' اور یہ کہہ کر ماسٹر عبداللہ اپنی جگہ سے اٹھے اور کمرے کے باہر جا کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے آواز دی ''اندر آجاؤ۔''

اتنے میں دو خواتین چادر میں لپٹی ہوئیں سہمی سہمی سی آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئیں کمرے میں داخل ہوئیں۔

معاملہ کچھ عجیب وغریب پُراسراریت اختیار کر چکا تھا۔

''بلوچ خان، آپ کو دو کرسیوں کا مزید انتظام کرنا ہوگا'' ماسٹر عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بلوچ خان نے فون اٹھایا اور شاکر خان کو مزید کرسیاں لانے کو کہا اور فون نیچے رکھ دیا۔ چند لمحوں میں کرسیاں آگئیں۔ ماسٹر عبداللہ نے اپنے ساتھ آنے والی لڑکیوں کو اشارہ کیا کہ وہ بیٹھ جائیں۔ دونوں لڑکیاں خاموشی سے بیٹھ گئیں۔ ماحول پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ گہرے سکوت کو توڑتے ہوئے ماسٹر عبداللہ نے امبرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''بہن یہ دونوں لڑکیاں آپس میں بہنیں ہیں۔ بڑی لڑکی کا نام زرین اور چھوٹی مہ نور ہے۔ ان کا آپ کے شوہر کے قتل سے بڑا گہرا تعلق ہے'' ماسٹر عبداللہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''تین سال پہلے دونوں بہنیں اپنے والد اور دو بھائیوں کے ساتھ یہاں سے بیس کلومیٹر دور ایک گاؤں میں ہنسی خوشی رہتی تھیں۔ والدہ ایک بیماری میں چند سال

پہلے وفات پا چکی تھیں۔ اب گھر کا سارا انتظام زرین ہی سنبھالتی تھیں۔ ہاں البتہ چھوٹی کو ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا جو اب ایک خواب بن کر رہ گیا ہے۔ دو سال پہلے جب نوجوانوں کی سیاست اور آزادی کی لہر نے چاروں طرف گھر کر لیا تو زرین کے دونوں بھائی بھی اس میں شامل ہو گئے۔ اور پھر ایک دن اچانک بڑے بھائی کی لاش گھر میں آ گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ بے گناہ پولیس کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ ابھی اس کا کفن میلا نہ ہوا تھا کہ چھوٹا بھائی اچانک غائب ہو گیا۔ گاؤں والوں اور دوست احباب سب نے مل کر اسے بہت ڈھونڈا لیکن بے سود۔ رفتہ رفتہ یہ خبر عام ہوئی کہ سرفراز بلوچ کو کسی نے لاپتہ کر دیا ہے۔''

ماسٹر عبداللہ سانس لینے کے لئے چند لمحے رکا اور پھر بولا:

''امبرین بہن مرنے والے کا غم تو سنبھالا جا سکتا ہے لیکن زندہ انسان کے کھو جانے کا غم بہت گہرا اور انمٹ ہوتا ہے۔ اس غم میں مبتلا گزشتہ دو سال سے زرین کا بوڑھا باپ اپنے بیٹے کو نگر نگر تلاش کرتا رہا۔ وہ مرنے سے پہلے آخر دم تک یہ یقین کرنے کو تیار نہ تھا کہ اس کے بیٹے کو اسی ملک کے کسی ادارے یا پولیس نے اغوا کیا ہے۔ وہ ملکی اداروں کو شک سے بالاتر سمجھتا تھا۔ وہ تو جب کچھ اور لڑکے بھی اسی طرح غائب ہوئے تو یہ معاملات تمام اخبارات میں آنا شروع ہو گئے۔ اور رفتہ رفتہ باپ کو یقین آ گیا۔ جب سے وہ ایسا دکھی اور بیمار ہوا کہ بالآخر موت نے اسے سکون دیا۔ بوڑھا باپ مرتے دم تک اپنے بیٹے کو پکارتا رہا۔''

یہ کہہ کر ماسٹر عبداللہ خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ اور نہ تھا۔ اچانک کمرے میں آہستہ آہستہ سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ بلوچ خان اور ماسٹر عبداللہ

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ادھر صوفہ پر امبرین ہلکے ہلکے سسکیاں لے رہی تھی دوسری طرف زرین اوراس کی بہن۔ اتنے میں امبرین اٹھی اور زرین کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ اورآہستہ سے اس کا بازو پکڑااوراسے اپنے ساتھ کھڑا کرلیا۔ زرین اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پاسکی اور بلکتے ہوئے امبرین سے لپٹ گئی۔اورزاروقطار رونے لگی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا تو سوائے درد کے کچھ اور نہ ملا۔دونوں کے دکھ اس قدر گہرے تھے کہ ان کی روحیں تک بلبلا اٹھی تھیں۔

امبرین نے زرین کا بازو پکڑ کر اسے اپنے پاس صوبے پر بٹھالیا تو زرین سے رہانہ گیا۔اوررندھی ہوئی آواز میں بولی:

’’امبرین اب تم بتاؤ، اپنے دو بھائیوں اور باپ سے محروم لڑکی اور کیا کرتی۔ جس بدگمانی نے اس کا پورا خاندان لوٹ لیا تھا بالآخر وہ اس کا شکار کیونکر نہ ہوتی۔ اور وہی وہ لمحہ تھا جب میں نے بدلہ لینے کا سوچ لیا۔اور بدقسمتی نے تمہارے شوہر کو چن لیا۔‘‘

زرین اب بلک بلک کر رو رہی تھی اور کہتی جا رہی تھی ’’میں تمہاری مجرم ہوں ....میں تمہاری مجرم ہوں۔‘‘

امبرین کو ایسے معلوم ہوا جیسے اس کے سینے میں کسی نے کوئی چھرا گھونپ دیا ہو اور درد کی لہریں اس کے سینے سے نکل کر پورے جسم میں زوداثر زہر کی طرح پھیل رہی ہوں۔اس نے نوید کا ہاتھ کھینچ کر اپنے قریب کیا اور زرین سے مخاطب ہوئی:

’’لو، یہ میرا لختِ جگر نوید اب تمہارا چھوٹا بھائی سرفراز بلوچ ہے۔ یہ آج سے تمہارا ہے۔تم سمجھو کہ تمہارا کھویا ہوا سرفراز تمہیں واپس مل گیا ہے۔‘‘

”میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔لیکن صرف ایک شرط پر کہ تم اب مہ نور کو میرے ہمراہ کر دو تا کہ اس کے اور اس کے بھائی سرفراز بلوچ کے خواب پورے ہوں اور یہ ایک ڈاکٹر بن جائے۔“

بلوچ خان اور ماسٹر عبداللہ یہ سارا منظر خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ بڑے عرصے کے بعد انہوں نے یوں محبت کے شفاف چشمے پھوٹتے دیکھے تھے۔ آہستہ آہستہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں لے کر کمرے سے باہر کھلی ہوا میں آ گئے۔

پہاڑوں سے آنے والی بادِ خنک نے ان کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے انہیں ایک نئی زندگی کی نوید دی اور آبِ گم کے ویران ریلوے اسٹیشن نے رات کے اس پہر میں پوری ایک صدی کے بعد ایک نئی کہانی کو جنم ہوتے دیکھا۔

پہلا اسکول

نوا یکم نو....نو دونی اٹھارہ....نو تیئے ستائیں۔

جماعت پنجم نو کے پہاڑے کو اپنے دیہاتی لہجہ میں چرچ کی گھنٹی کی طرح آگے پیچھے ڈولتے یاد کررہی تھی۔

پنج دریا گاؤں شہر سے دور مشرق کی سمت ایک خاموش سا قصبہ تھا اور گورنمنٹ مڈل اسکول اس گاؤں کا واحد اسکول تھا جہاں ہیڈ ماسٹر کی مرضی چلتی تھی اور گاؤں والے اسے پسند بھی کرتے تھے۔

وہ اوائل ستمبر کی ایک گرم صبح تھی۔ موسم میں شدت تھی اور ساون اپنی جوانی کے آخری حصہ میں تھا۔ آسمان سے برستی آگ بے انتہا حبس جس میں سانس لینا بھی دشوار ہو، نے ماحول کو اور زیادہ گھٹن زدہ کردیا تھا۔

تاہم جماعت پنجم اپنے روزمرہ معمول کے مطابق کھلے آسمان کے نیچے ایک عمر رسیدہ لیکن تناور درخت کے سائے میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھی۔ لکڑی کے ایک بوسیدہ ٹوٹے ہوئے اسٹینڈ جس کو مشکل سے اسی درخت کے سہارے کھڑا کیا گیا تھا پر ایک بلیک بورڈ دھرا تھا۔ ساتھ میں ایک کرسی براجمان تھی اور یہ استاد عبدالرحمٰن کی واحد سلطنت تھی۔

آج جمعہ کا دن تھا اور جماعت کی حاضری بہت کم تھی۔ صرف سات شاگرد اپنے چھوٹے چھوٹے بستے سنبھالے حساب کے چند صفحات پر مشتمل مختصر کتاب ہاتھ میں تھامے پہاڑے رٹ رہے تھے۔

یوں تو اسکول کا نام گورنمنٹ مڈل اسکول تھا لیکن گاؤں بھر میں اسے پیلا اسکول کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وجہ شہرت یوں تھی: زمانہ پہلے یہ شاندار عمارت پیلی اینٹوں سے بنائی گئی تھی۔ تقسیم ہند سے پہلے اسے انگریزوں نے بنایا تھا۔ دس کمروں پر مشتمل ایک لمبی قطار تھی۔ درمیان میں ایک بڑا ہال تھا جو دونوں طرف سے کھلا تھا جہاں صبح صبح اسکول کی اسمبلی کی تقریب ہوا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ حالات کی بے رخی نے اسکول کی عمارت کو ایک کھنڈر میں تبدیل کر دیا تھا۔ چھتیں اور بیشتر دیواریں گر چکی تھیں۔ لہٰذا بقیہ ڈھانچہ اب گاؤں والوں کو حواجاتِ ضروری کی سہولت فراہم کرتا تھا۔

جماعت پنجم سے قدرے دور ایک آم کے گھنے پیڑ کے سائے میں اساتذہ کی مارننگ میٹنگ جاری تھی۔ میٹنگ کیا تھی بس مل بیٹھنے کا ایک بہانہ تھا۔ گاؤں کے معاملات سے ملکی سیاست تک گرما گرم بحث ہوا کرتی۔ اسکول کے صرف تین اساتذہ تھے جنہوں نے اپنی اپنی سہولت کی خاطر سب جماعتوں کو آپس میں بانٹ رکھا تھا۔

آج کا موضوع اسمبلی میں ایک نئے قانون کی منظوری تھا۔

''عبدالرحمٰن، تمہاری کلاس بہت محنتی ہے'' ہیڈ ماسٹر نے عبدالرحمٰن جو جماعت پنجم کے انچارج تھے، سے کہا۔

''جناب میں سمجھتا ہوں اگر شاگرد کم ہوں تو کلاس زیادہ پُروقار اور سنجیدہ ہوتی ہے'' عبدالرحمٰن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن آپ بتا رہے تھے کہ پچھلے دنوں ایک نیا قانون اسمبلی نے پاس کیا ہے۔ وہ کیا ہے سر'' عبدالرحمن نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ایسا سنا ہے کہ اسمبلی نے ایک نیا قانون پاس کیا ہے جس کی رُو سے اب بچے اسکول میں موبائل فون استعمال نہیں کر سکتے ہیں۔ نئ ٹیکنالوجی کے بارے میں ان کے بہت تحفظات ہیں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے، جناب۔ بالآخر انہوں نے ایک اچھا فیصلہ کر لیا ہے۔ کم از کم یہ شیطانی عمل یہاں تو ختم ہوا۔''

عبدالرحمٰن نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ عبدالرحمٰن بنیادی طور پر دقیانوسی خیالات کے حامل تھے۔ زندگی کے تمام معاملات میں ان کا رویہ ہمیشہ ایک سخت اور کھردرے انسان کی طرح رہا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے زندگی میں کافی ناکامیوں کا سامنا کرنے کے بعد اپنے ہی گاؤں میں استاد کا پیشہ اپنا لیا تھا۔

''ہاں، یہ بات تو بالکل درست ہے کہ اسکول میں پڑھائی کے دوران موبائل فون کا استعمال نہیں ہونا چاہئے'' نفیس نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔ نفس اسکول کے تیسرے استاد تھے۔ ''لیکن ایک بات ضرور ذہن میں رکھیے کہ اب

اکیسویں صدی کا آغاز ہو چکا ہے۔ میں ذاتی طور پر سنجیدہ پڑھائی کے حق میں ہوں لیکن بچوں کو اگر آپ نئی ٹیکنالوجی سے دور رکھیں گے اور سنجیدگی سے انہیں اس کی تعلیم نہیں دیں گے تو یقیناً اس کی خوبیاں اور خرابیاں ان پر عیاں نہ ہو سکیں گی۔ دراصل یہ ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم اپنے بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ماحول سے وابستگی کی تربیت بھی دیں۔ جہاں غربت اپنے عروج پر ہو، بنیادی حقوق اور انسانی تحفظ مشروط ہو وہاں یہ ذمہ داری اور بھی اساتذہ پر آن پڑتی ہے کہ وہ معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کو مثبت انداز سے دیکھیں اور اپنے علم سے ان کا مقابلہ کریں۔ صرف پابندیاں لگا دینے سے تو مسائل حل نہیں ہوتے۔''

''یہاں غربت اور انسانی تحفظ کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ یہ ایک ایسی شیطانی ایجاد اور عمل کی بات ہو رہی ہے جس میں مغرب خود بھی الجھا ہوا ہے'' عبدالرحمٰن قدرے جوش سے بولے۔ ''اور موبائل فون تو بلاشبہ ایک شیطانی ایجاد اور عمل ہے جو جھوٹ کی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ اس کے استعمال کی تو سوائے معدودے چند لوگوں کے کسی کو اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ سچ پوچھئے تو اسے ملک بھر میں محدود کر دینا چاہئے۔ ایک مڈل اسکول کی جماعتیں تو الگ رہیں۔'' عبدالرحمٰن نے قدرے غصہ سے ہیڈ ماسٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ دراصل ان کا اشارہ تو نفیس کی طرف تھا لیکن وہ بوجوہ ایسا نہ کر سکے۔

''بہت خوب مجھے آپ سے یہی امید تھی عبدالرحمٰن صاحب۔ کیا آپ اسے مڈل اسکول کی جماعت کہتے ہیں۔'' نفیس نے پانچویں جماعت کے لڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے تلخی سے کہا۔

’’کھلے آسمان کے نیچے گرمی سے بے حال ننگی گھاس پر بیٹھے ہوئے چند لڑکوں کے جھرمٹ کو آپ جماعت پنجم کہتے ہیں۔ان بچوں سے پوچھئے کہ کس قدر وہ آپ کی مار کے خوف کو دھڑکتے دلوں کے ساتھ اپنے بھوکے چہروں پر سجائے پھر بھی پڑھ رہے ہیں۔اگر آپ نے نیا قانون بنانا ہی ہے تو سب سے پہلے اسکولوں میں جسمانی تشدد کے خلاف قانون بنایئے۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ بحث کو یہیں پر ختم کرتے ہیں اور اپنی اپنی کلاسوں میں چلتے ہیں۔‘‘ ماحول کی گرما گرم بحث کو ختم کرتے ہوئے ہیڈ ماسٹر نے میٹنگ برخواست کرنے کا حکم صادر کر دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔دونوں اساتذہ بھی اپنے اپنے حاضری کے رجسٹر تھامے کھڑے ہو گئے۔

’’کلاس کھڑی ہو‘‘ شیرا ہاتھ میں درخت کی شاخ سے بنی ہوئی ایک مضبوط چھڑی سنبھالتے ہوئے غرایا۔شیرا کلاس مانیٹر تھا۔سخت جسم و جان کا مالک جسامت میں اپنے ہم جماعت لڑکوں میں بظاہر بڑا لگتا تھا۔

ساری کلاس اپنے ہاتھوں میں حساب کی ننھی کتابیں تھامے ایک دم کھڑی ہو گئی۔صرف ایک لڑکا خالد اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔خیالوں میں ڈوبی اپنی خالی آنکھوں سے دور خلاؤں میں نا جانے کسے گھور رہا تھا۔شاید اسے پتہ ہی نہ چلا تھا کہ ٹیچر کلاس میں آ چکے ہیں۔شیرا نے اپنی چھڑی سے خالد کی طرف اشارہ کیا لیکن بے سود۔تاہم وہ کلاس ٹیچر کی موجودگی میں اسے کچھ کہہ نہ سکا۔

’’بیٹھ جاؤ بچو‘‘ عبدالرحمٰن نے شائستگی سے بچوں کو کہا۔اور خالد تم میرے پاس آؤ۔‘‘

کلاس حیرت زدہ تھی۔ انہوں نے ہمیشہ عبدالرحمٰن کو ایک سخت گیر استاد کے روپ میں دیکھا تھا جو بچوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو بھی معاف نہ کرتے تھے اور ہمیشہ شیرا کی چھڑی ان کے استعمال میں رہتی۔ لیکن آج ایک دم ان کے نرم لہجے کی مسرت ان کی حیرت کا سبب تھی۔ خالد آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے عبدالرحمٰن کے قریب آیا تو انہوں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ خالد مجسم یاسیت کی تصویر بنا ان کے سامنے کھڑا تھا۔ عبدالرحمٰن نے دل میں اپنے آپ کو کوسا اور خالد سے مخاطب ہوئے:

''تم خیریت سے ہو۔''

خالد نے دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے ہلکی سی بے معنی سی آواز نکالی۔

عبدالرحمٰن حیران تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کہاں دیکھ رہا ہے۔ جب انہوں نے اُفق کے پار اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو انہیں احساس ہوا کہ دور کھیتوں کے پار کالے دھندلے بادل تیزی سے گاؤں کی طرف آ رہے ہیں۔ عبدالرحمٰن سمجھ گئے کہ یہ یقیناً آندھی ہے جو تیزی سے اسکول کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ایک بڑا بگولہ آسمان کی طرف مینار کی مانند حجم میں پھیل رہا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور شیرا کو جلدی سے اسکول کی گھنٹی بجا دینے کو کہا۔

تمام بچوں نے بھی اب اس آندھی کو دیکھ لیا تھا جو بڑی سرعت سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

جب تک بچے اپنے اپنے بستے سنبھالتے آندھی ان کے سروں پر آن پہنچی تھی۔ درختوں کی شاخیں زور زور سے ہلنے لگیں۔ زمین پر بکھرے ہوئے پتے اور گھاس

پھونس اڑ کر جسموں سے ٹکرانے لگے۔ آندھی کی تند و تیز ہوا کے شور نے ایک خوف کی فضا طاری کر دی تھی اور چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ گرجتے ہوئے بادلوں اور بجلی کی کڑک نے معصوم بچوں کے دلوں پر خوف کی ایک نئی لہر بچھا دی تھی اور وہ چیختے چلاتے اپنی اپنی نامعلوم منزلوں کی طرف بھاگنے لگے۔ چند ایک بڑے درختوں کی اوڑھ میں چھپنے کے لئے دوڑے۔

بلیک بورڈ ہوا کے زور سے اڑ کر کہیں دور جا گرا۔ دور کہیں ایک زوردار دھما کے کی آواز آئی۔ شاید پیلا اسکول کے کھنڈر کی کوئی دیوار گری تھی۔ اسی اثناء میں چھما چھم بارش شروع ہو گئی۔

عبدالرحمٰن منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے ایک جانب دیکھ رہے تھے کہ ہوا کے ایک زوردار تھپیڑے نے انہیں دور اچھا دیا۔ زندگی میں پہلی دفعہ انہوں نے خوف کی ایک لہر اپنی ہڈیوں میں اترتے ہوئے محسوس کی اور انہوں نے با آواز بلند کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ اسی اثناء میں جس درخت کے قریب وہ کھڑے تھے ایک بڑی شاخ زوردار تڑاخے کی آواز کے ساتھ ٹوٹ کر زمین پر گری۔ گھپ اندھیرا ہونے کے باعث وہ دیکھ نہ سکے کہ کیا ہوا تھا۔ ابھی ان کے حواس درست بھی نہ ہوئے تھے کہ اپنے قریب سسکیوں سے بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ انہوں نے اندھیرے میں آگے بڑھنے کی کوشش کی اور ایک پتھر سے ٹکراتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑے۔ ان کا ہاتھ ایک نرم نرم جسم کو چھو رہا تھا۔ انہوں نے خوف سے پکارا:

''کون ہے؟''

سسکیوں نے ایک اور سسکی لی اور خوف میں ملبوس ایک روتے ہوئے بچے کی

آواز سنی

''سر! میں ہوں خالد۔''

''کیا ہوا؟''

''سر میری ٹانگیں'' خالد بلبلا اٹھا۔

عبدالرحمٰن نے ٹٹول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ خالد درخت کی ایک بڑی سی بھاری شاخ کے نیچے دبا ہوا تھا اور شاید اس کی ٹانگیں تنے کے بوجھ تلے ٹوٹ چکی تھیں۔

عبدالرحمٰن نے اپنی پوری قوت کے ساتھ شاخ کے تنے کو خالد کے اوپر سے اٹھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ منوں وزنی شاخ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بارش کا پانی تیزی سے ان کے سر سے بہہ کر آنکھوں میں جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنے دائیں ہاتھ کی پشت سے اسے صاف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس قدر تیز بارش نے ان کے حواس باختہ کر دیئے تھے۔ عبدالرحمٰن کو کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔

انہوں نے بے اختیار اضطرابی حالت میں زور سے کسی کو مدد کے لئے پکارا لیکن کوئی موجود نہ تھا۔ اپنی آنکھوں سے بارش کے پانی کو پھر اپنے ہاتھ سے پونچھا اور دوبارہ گلے کے پورے زور سے ہانک لگائی۔

''ارے کوئی ہے جو ہمارے مدد کرے؟'' لیکن ان کی آواز آندھی اور بارش میں ڈوب کر غائب ہوگئی۔ انہیں اپنی بے بسی پر رونا آیا۔ اتنے میں خالد کی سسکی ابھری۔ اور وہ اندھیرے میں اس کے چہرے کی طرف اکڑوں بیٹھ کر ٹٹولنے لگے۔ اب انہیں کچھ کچھ دکھائی دے رہا تھا۔

خالد روتے ہوئے اپنی جیب میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں اس نے اپنی جیب سے چھوٹی سی چیز نکالی اور اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے عبدالرحمٰن کو تھما دی۔

''سر یہ موبائل فون شاید ہماری مدد کر سکے۔''

ریزہ چین

گزرے ہوئے دن، بیتی باتیں اور گمشدہ ذہنی اوراق اپنے اندر گرانقدر واقعات اور جذبے چھپائے رکھتے ہیں کہ انسان اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے بھی بے قابو ہو جاتا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ ایسی کونسی انہونی بات ہے جس پر یہ تمہید باندھی جارہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں آپ اسے زندگی کی خوشگوار اور مہکتی علامت قرار نہ دیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ علامتیں جو اپنے وجود سے باہر نکل کر حقیقت کا روپ دھارتی ہیں تو وہ غم زدہ چہروں پر امید کی کرنیں بکھیرتے ہوئے زن سے گزر جاتی ہیں اور محسوس کرنے والے ساکت و جامد کھڑے حیران آنکھوں سے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ اور اس طرح دونوں طرف کے اہداف پورے ہو جاتے ہیں اور قدرت مسکراتے ہوئے چہروں سے نظریں ملائے

بغیر ہی آگے بڑھ جاتی ہے۔

چلئے میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔ یہ کوئی بیس سال پہلے کی بات ہے جب روپیہ کی قدر و قیمت اس قدر مضروب نہ ہوئی تھی۔ بدرالدین اپنے شیشے کے کیبن میں بحیثیت بنک منیجر اپنے روزمرہ کے فرائض سرانجام دے رہے تھے کہ ایک صاحب تشریف لائے جو بینک کے کافی پرانے اور مالدار کلائنٹ تھے۔ بدرالدین انہیں دیکھتے ہی استقبالی قدموں سے آگے بڑھے اور معانقہ کیا۔ انہوں نے بیٹھتے ہوئے ایک بھاری رقم کا چیک بدرالدین کے سامنے رکھ دیا جسے وہ کیش کرنا چاہتے تھے۔ شہر کی سب سے بڑی بینک کی برانچ اور پچاس لاکھ روپیہ کا چیک۔ چونکہ یہ غیر معمولی ٹرانزیکشن تھی لہٰذا بدرالدین نے اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لئے ان صاحب سے کہا کہ بینک کے اندر تو یہ رقم محفوظ ہے اور آپ کا چیک کیش ہو جائے گا لیکن اس قدر زیادہ کیش آپ کس طرح سے باہر لے کر جائیں گے۔ کیا آپ کے پاس اس کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام ہے۔

وہ صاحب لاپرواہی سے بولے بس گاڑی بینک کے باہر کھڑی ہے، میں اسی طرح کیش لے کر گاڑی میں رکھ لوں گا۔ گو کہ یہ انتظام بدرالدین اور بینک کے نقطہ نظر سے ناکافی تھا لیکن انہوں نے کلائنٹ کے اصرار پر حامی بھر لی۔ کلائنٹ شاید جلدی میں بھی تھے لہٰذا ان کی توجہ صرف اس بات پر تھی بینک جلد از جلد رقم کا انتظام کر کے ان کے حوالے کرے۔ چند ہی لمحوں میں کیش سے بھرے ہوئے تین بڑے خاکی لفافے ان کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیئے گئے اور ان سے کہا گیا کہ وہ کیش گن لیں۔ وہ زمانہ چونکہ بداعتمادی اور بددیانتی کی موجودہ حدود کو پار نہ کر پایا تھا لہٰذا انہوں نے

مسکرا کر بدرالدین کا شکریہ ادا کیا اور کیش کے لفافے دونوں ہاتھوں سے اٹھاتے ہوئے سینے پر لگائے اور بینک سے باہر نکل گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد بینک کا کیشیر بدرالدین کے کمرے میں آیا اور اس کے ساتھ ایک انتہائی غلیظ کپڑوں میں ملبوس لانبا قد، بکھری ہوئی کچھڑی نما داڑھی، چپل پہنے مسکین سی صورت بنائے شخص تھا۔ کیشیر نے کہا ''سر یہ پچاس ہزار روپیہ کا ایک پیکٹ لایا ہے اور اس کا چینج مانگ رہا ہے۔'' بات چونکہ بڑے اچنبھے کی تھی لہٰذا بدرالدین نے اس سے پوچھا ''بابا تم چینج کا کیا کرو گے'' تو اس نے کہا مجھے تقسیم کرنے کے لئے دس دس اور پچاس پچاس روپیہ والے نوٹ دے دو۔ بدرالدین نے از راہ تفنن پوچھا بابا اتنے پیسے کہاں سے لائے ہو۔ تو کہنے لگا ابھی ابھی اللہ نے بھجوائے ہیں۔ بدرالدین کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے۔ بہرحال انہوں نے کیشیر کو اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ نوٹ چیک کرلو۔ اگر ٹھیک اور اصلی ہیں تو بابا کو چینج دے دو۔ اس پر وہ شخص بولا ''تم اللہ پر شک کرتے ہو کہ وہ مجھے جعلی نوٹ بھجوائے گا۔''

بدرالدین نے فوراً دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''نہیں بابا جی یہ بات نہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم رقم دیتے اور لیتے وقت یہ اطمینان کرلیں کہ نوٹ اصلی ہیں کہ نہیں۔'' تو کہنے لگا ''بہت خوب۔ یہ نوٹ تو آپ کے بینک سے جاری ہوئے ہیں۔'' یہ انکشاف بدرالدین کے لئے بالکل نیا تھا۔ انہوں نے پیکٹ کا بغور معائنہ کیا اور معلوم ہوا کہ واقعی اس پر بدرالدین کے بینک بلکہ برانچ کی مہر ثبت ہے۔ اور تاریخ عین آج کی ہی درج ہے۔

بدرالدین بہرحال ابھی اسی سوچوں میں غلطاں تھے کہ اچانک فون کی گھنٹی

بجی۔انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے کیشیر اور بابا جی کو جانے کو کہااور خود فون سننے لگے۔ یہ انہی کلائنٹ کا فون تھا جو آدھ گھنٹہ پہلے پچاس لاکھ روپیہ لے کر گئے تھے۔ بدرالدین نے فوراًان سے پوچھا کہ آپ خیریت سے پہنچ گئے ہیں اور کیا رقم بھی محفوظ رہی۔تو انہوں نے کہا ''ہاں ہاں۔کوئی فکر کی بات نہیں میں اور رقم بالکل محفوظ ہیں۔ ہاں البتہ آپ کے بینک باہر میں آج لٹتے لٹتے بچ گیا۔''

بدرالدین بہت حیران ہوئے اور فوراًپوچھا کیسے جناب۔کیا ہوا؟ تو کہنے لگا کہ جب میں آپ کے بینک سے باہر نکلا تو سامنے سے ایک بوڑھے سے فقیر نما شخص نے میرا راستہ روک لیا۔ وہ اچانک کسی طرف سے آیا تھا اور ایک دم سے میرے سامنے رک کر درشتی سے کہنے لگا ''اللہ کے نام پر خیرات کرنی ہےاور پیسے دے دو۔''

بدرالدین صاحب، آپ یقین کریں میرا تو سانس اندر کا اندر اور باہر کا باہر رہ گیا۔آپ کی نصیحت یاد آئی اور پچھتایا۔ مجھے ایسے لگا کہ اگر میں نے اسے کچھ نہ دیا تو یقیناً یہ میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تین لفافوں میں سے ایک آدھ تو لے ہی جائے گا۔ چنانچہ میں نے فوراًایک لفافے سے ایک پیکٹ نکالا اور اس کے حوالے کر دیا اور تیزی سے پہلو بچاتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر گھس گیا۔ جب تک وہ فقیر نما لٹیرا حیران و پریشان نوٹوں کا پورا پیکٹ ہاتھ میں پکڑے کچھ سنبھلتا، میں نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی اور یہ جاوہ جا۔اب آفس میں آکر سانس بحال کی ہے تو آپ کو فون کر رہا ہوں۔

بدرالدین نے چند لمحوں کے توقف کے بعد پوچھا کیا آپ نے اسے پورے پچاس ہزار کا پیکٹ دیا تھا۔تو انہوں نے کہا ''جی ہاں'' اور پھر کہنے لگے ''بدرالدین

صاحب اس لٹیرے کی مہربانی تھی وہ خیرات مانگ رہا تھا ورنہ اگر وہ مجھ سے ایک یا سارے نوٹوں سے بھرے لفافے چھین لیتا تو میں کیا کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے رقم بچانے کے لئے اسے اس کی خواہش سے زیادہ رقم دے دی تا کہ وہ حیران و پریشان کھڑا رہے اور میں باقی رقم لے کر نکل جاؤں۔‘‘

بدرالدین نے انہیں خدا حافظ کہا اور خاموشی سے فون بند کر دیا۔ اور پھر وہ کئی روز تک بینک نہ آ سکے تھے۔

محبت آشنا

مہرین آرا، بیالیس فلائیڈ کلوز، ساؤتھ لندن۔

مہرین نے دروازے کے اندر داخل ہوتے ہوئے جب اپنی ڈاک کے ڈھیر کو فرش سے اٹھایا تو ایک موٹا سا خاکی لفافہ اسے مانوس سا لگا۔ سرنامہ پر تحریر کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ اس نے جلدی سے پلٹ کر بھیجنے والے کے نام کو دیکھا اور ایک لمبی سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

علی جمال فرام پاکستان۔

مہرین کو لندن آئے ہوئے تقریباً چھ برس ہو چکے تھے۔ ان چھ برسوں نے اسے کتنے رنگ دکھائے۔ کتنے سکھ اور دکھ دیئے۔ اسے ایک ایک پل اچھی طرح سے یاد تھا۔ فراز سے شادی سے طلاق تک کا سفر ایک عہدِ رفتہ بن چکا تھا۔ اور بالآخر وہ اپنی

تنہا زندگی کی ڈور سنبھالے کسی نہ کسی طرح سے اپنا سفر تمام کر رہی تھی۔اماں کے پاکستان میں انتقال کرنے کے بعد تنہائیاں اور بڑھ گئی تھیں۔

انسانی رشتے نہایت کمال کے ہوتے ہیں۔جب تک آپ نبھاتے ہیں یہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آپ کے پہلو میں روشن اور جگمگاتے ہوئے زندہ رہتے ہیں۔ ادھر آپ نے چنداں پہلو تہی کی ادھر ردعمل ظاہر ہوا۔انسانی جبلت اسی کا نام ہے۔

لیکن اس سارے معاملے میں ماحول اور حالات ایک اضافی عنصر کے طور پر بہرحال کارفرما رہتے ہیں۔جو اپنے اثرات کبھی فوراً، کبھی دیر آید اور کبھی لالہ طور اپنا عکس ثابت کرتے رہتے ہیں اور انسان ان تغیرات کو اپنے اندر سمونے کی کوشش میں رفتہ رفتہ زندگی کی دوڑ میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔میرا مطلب قطعی طور پر مادی ترقی یا تنزلی سے نہیں بلکہ وہ ایک ارتقائی عمل سے گزرتا ہوا اعمال کی کسوٹی پر ایک مکمل انسان بننے کی لاشعوری کوشش کرتا ہے۔وہ کہاں تک کامیاب ہوتا ہے یہ دیکھنے والی سوسائٹی کی نظر ہے۔

مہرین نے خود کلامی میں کچھ کہا...اور ایک جھٹکا لے کر سیدھی ہوگئی۔

مہرین نے لفافے کو پھر غور سے دیکھا۔اسے ہمت نہ ہو رہی تھی کہ وہ یہ لفافہ کھولے۔علی جمال کی خوشبو اس لفافے سے آرہی تھی۔وہی خوشبو...وہی خوشنما تحریر۔

کیا خوبصورت دن تھے جب علی جمال چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسے بیسیوں کارڈ لکھ دیا کرتا تھا۔جب اپنی بنائی ہوئی تصویروں اور سکیچز پر انٹ شنٹ شعر لکھ کر اسے تھما دیا کرتا تو وہ گھنٹوں تنہائی میں بھی مسکراتی رہتی۔

یوں تو مہرین خوبصورتی اور حسن و جمال کا ایک نمونہ تھی لیکن جب علی اس کی

خوبصورتی کی تعریف کرتا تو وہ دنوں تک ان باتوں کے سحر میں گرفتار رہتی۔

بائیو میں ماسٹرز کرنے کے بعد مہرین نے ایک فارماسیوٹیکل کمپنی جائن کر لی تھی۔ یہ وہی دن تھے جب مہرین کی علی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسے مارچ کی وہ صبح ابھی تک یاد تھی جب وہ اپنے گھر سے آفس جانے کے لئے نکلی تو بڑی سڑک پر اس کی کار کا سامنے سے آنے والی وین سے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بظاہر یہ حادثہ معمولی تھا لیکن دھما کہ چونکہ زوردار تھا لہٰذا بے تحاشا راہ گیر آس پاس جمع ہو گئے تھے۔ مہرین سہم سی گئی۔ حادثہ کے خوف سے اس کے جسم پر ایک گھبراہٹ سی طاری ہو گئی تھی۔ حالانکہ سارا قصور دوسری گاڑی کا تھا لیکن لوگوں کو کون روک سکتا تھا۔

اتنے میں ایک نوجوان آگے بڑھا اور مہرین کے پاس کھڑا ہو کر آہستگی سے بولا: گھبرایئے نہیں، میرا نام علی جمال ہے اور میں آپ کا کزن ہوں۔ لہٰذا اب آپ خاموش رہیں اور مجھے یہ معاملہ نپٹانے دیں۔

پھر اس نے نہایت پھرتی اور شائستگی سے ہجوم کو چلتا کیا اور مخالف سمت سے ٹکرانے والی گاڑی کے مالک کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دیتے ہوئے بولا: گو کہ آپ کا زیادہ قصور ہے پھر بھی آپ چاہیں تو میری کزن آپ کا نقصان ادا کرنے کو تیار ہے۔ آپ اپنی گاڑی کی مرمت کروالیں اور مجھے بتادیں آپ کو رقم مل جائے گی۔

وہ صاحب بھی شاید آفس پہنچنے کی جلدی میں تھے اور انہیں اپنا قصور بھی معلوم تھا لہٰذا انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اس طرح یہ معاملہ خلافِ توقع چند منٹوں میں طے ہو گیا اور مہرین اور علی دونوں اکیلے سڑک پر رہ گئے۔

مہرین آراء نے آگے بڑھ کر علی جمال کا شکریہ ادا کیا اور از راہِ اخلاق اسے اپنا

وزیٹنگ کارڈ دیا۔ اسی اثناء میں علی جمال اپنا تفصیلی تعارف کروا چکا تھا۔ مہرین نے پہلی ہی ملاقات پر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ باتیں کرنے میں کوئی اس کا ثانی نہیں ہے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان چند لمحوں کی ملاقات میں مہرین اپنا دل ہار بیٹھی تھی۔ لیکن اس کا برملا اظہار کرنے میں مہرین نے کافی وقت لیا۔ تاہم علی نے اپنی دوسری یا تیسری ٹیلی فونک ملاقات میں پسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ ٹیلی فونک ملاقاتیں ذاتی ملاقاتوں میں بدل گئیں۔ اور پسندیدگی سے محبت کا سفر شروع ہو گیا۔

علی جمال واقعی کمال کا شخص تھا۔ نکھری ہوئی رنگت، درمیانہ قد، چہرے پر مردانہ وجاہت کا وقار۔ لیکن لباس کی تراش خراش میں کافی حد تک غیر سنجیدہ۔ ہمیشہ لاابالی سا۔ مصوری کرنا اس کا شوق تھا اور یہی اس کی پہچان تھی۔ آرٹ کا دلدادہ ہونے کے باعث ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کی تمنا گویا اس کا مشغلہ تھا۔

ماں باپ کا ایک حادثہ میں انتقال ہو چکا تھا۔ واحد اولاد ہونے کے ناطے اس کے ایک رشتہ کے چچا اس کی اور والدین کی چھوڑی ہوئی جائیداد کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ جب علی جمال سن بلوغت کو پہنچا تو ایک دو دفعہ چچا جان نے جمال سے کہا کہ وہ اپنی جائیداد سنبھالے تاکہ وہ اس کی کفالت کے بار سے عہدہ برآ ہو جائیں۔ لیکن علی جمال کی طبیعت اس طرف مائل نہ تھی۔ دوسرے وہ چچا سے جائیداد کی دیکھ بھال حاصل کر کے عمر کے اس حصہ میں ان کی مصروفیات سے انہیں محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لٰہذا یہ سلسلہ اسی طرح ہی چلتا رہا۔

علی اور مہرین کی ملاقاتیں اور گہری ہوئیں تو مہرین نے اسے دبے لہجہ میں کچھ

کام وام کرنے کو کہا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا: کیوں میری یہ زندگی تمہیں پسند نہیں ہے۔ سب کچھ تو کر لیتا ہوں حتیٰ کہ تمہارے تمام حکم تک سہہ لیتا ہوں۔ تمہیں اور کیا چاہیئے۔ بس اسی طرح سے وہ روزگار کی بات چیت سے پہلوتہی کر جاتا۔ اور یہ بات مہرین کی اماں کو تو بالکل پسند نہ تھی۔

اماں اور مہرین جب بھی گھر میں علی کی باتیں کرتیں تو ہمیشہ اماں نے یہی پوچھا: کیوں؟ وہ کچھ کر بھی رہا ہے یا اسی طرح مصوری کر کے گزارہ کرتا رہے گا۔ شاید اماں کو معلوم تھا کہ اس کی بیٹی علی کے سحر میں گرفتار ہو چکی ہے اور بالآخر ایک دن شادی کی بات ہو گی۔ لڑکے کو کچھ تو کرنا چاہیئے۔ میں دنیا کو کیا کہوں گی کہ داماد مصور ہے۔ بس یہی؟

اور وہی ہوا جس کا اماں کو ڈر تھا۔ ایک دن جب مہرین آفس سے گھر واپس آئی تو تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ اماں نے جلدی سے چائے بنا کر دی اور پاس بیٹھ گئیں۔ پوچھا تو مہرین نے بتایا کہ علی جمال شادی کی بات کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ اب دیر نہ ہونی چاہیئے۔

اماں کے خیال میں ابھی کچھ اور وقت گزرنا چاہیئے تھا تاوقتیکہ علی کسی روزگار پر کھڑا نہ ہو جائے۔ اور یہی بات مہرین نے اگلے روز ملاقات میں علی سے کہہ دی۔ علی نے تحمل سے ساری بات سنی اور خاموش ہو گیا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ شائستہ انکار ہے۔

وہ بدستور مہرین سے ملتا رہا لیکن اب تعلقات میں وہ گرمجوشی نہ رہی حالانکہ علی نے قطعی طور پر ایسا ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ انکار سے ناراض ہے۔ اور نہ ہی پھر کبھی مہرین نے شادی کا ذکر چھیڑا۔

رفتہ رفتہ ملاقاتیں کم ہونے لگیں۔ دوسری طرف چچا جان کے کاروبار میں

پے در پے نقصان ہونے کی وجہ سے آمدن بالکل ٹھپ ہو کر رہ گئی تھی۔ علی جمال اب بھی اسی طرح ملتا تھا لیکن اب مالی حالات سے مجبور ہو کر اس کی شخصیت میں تبدیلی آ رہی تھی۔ ایک طرف شادی سے انکار پر دلی طور پر افسردہ سا ہو گیا تھا۔ دوسری طرف مالی پریشانیوں نے اس کی زندگی میں دلچسپی محدود کر دی تھی۔ ایسا وقت بھی آیا کہ مہرین نے اپنے طور پر خاموشی سے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی لیکن علی جمال ایک خوددار شخص تھا۔ وہ کسی قیمت پر مہرین سے مالی امداد کا قائل نہ تھا۔

یہی وہ دن تھے جب اماں نے مہرین آراء کی ڈھلتی جوانی کے خوف سے گھبرا کر مہرین کی سہیلی بنٹی کے بھائی فراز جو لندن میں اپنا ذاتی کاروبار کرتا تھا، سے مہرین کا رشتہ طے کر دیا۔ مہرین نے بہت احتجاج کیا لیکن اماں کے سامنے ایک نہ چلی۔ وہ پہلے ہی علی کو بتا چکی تھی کہ اگر وہ اسی طرح بے روزگار رہا تو ایک دن اسے کھو دے گا۔ مہرین کو اماں سے بہرحال یہ توقع نہ تھی کہ یوں جھٹ پٹ ایک روز اس کی شادی فراز سے کر دیں گی۔ یہ سوچ بھی مہرین کے لئے سوہانِ روح تھی لیکن وہ اماں کے سامنے کچھ کہہ نہ سکی۔ بے بسی کے عالم میں آنکھوں میں سرخ ڈورے لئے ایک دن علی جمال سے کچھ کہے سنے بغیر ہی پیا دیس سدھار گئی۔

علی جمال اب اپنی الجھنوں کے درمیان فگار دل لئے سڑکوں پر یونہی شب و روز کرنے لگا۔ مہرین کی شادی نے اسے بالکل یک و تنہا کر دیا تھا۔ ایک طرف جذباتی صدمہ اور دوسری طرف مالی مشکلات۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ذہنی توازن کھو رہا ہے۔

مہرین نے لندن جانے سے پہلے اسے کئی بار فون کیا اور بات کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ علی یونہی کھویا کھویا سا چند لمحے بات کرتا اور پھر اچانک فون بند کر

دیتا۔ پھر ایک دن اچانک علی نے مہرین کو فون کیا اور باتوں باتوں میں اسے اپنے مسائل بتائے۔ ذہنی اور مالی دباؤ اس قدر شدید تھا کہ علی جمال کو فون کرنا پڑا اور اسے یقین تھا کہ جب وہ اپنے حالات مہرین سے کہے گا تو مہرین یقیناً اس کی مدد کرے گی۔ اور یہی سوچ کر اس نے فون کیا تھا۔ اسے اپنی محبت پر پورا یقین تھا۔ لیکن اب مہرین کے حالات بدل چکے تھے۔ مہرین نے جواباً اپنے مسائل بتانے شروع کر دیئے۔ علی خاموش سا ہو گیا۔ صرف پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس نے فون کو دیکھا اور اسے بند کر دیا۔

مہرین لندن جا چکی تھی لیکن وہ علی جمال کو بھول نہ پائی حالانکہ اپنی ازدواجی زندگی میں پوری طرح فراز کا ساتھ دے رہی تھی لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ نکلا تھا۔ فراز مکمل طور پر ایک کاروباری ذہنیت کا آدمی تھا اور اوپر سے قدرے عیاش بھی۔ آخر کار طلاق ہونے کے بعد ایک کمرے کے فلیٹ میں بمشکل تمام اپنی زندگی گزار رہی تھی۔

اماں کے پاکستان میں انتقال کے بعد واپس جانے کا سوال ہی ختم ہو چکا تھا۔

مہرین نے خاکی لفافے کو پھر غور سے دیکھا اور آہستہ آہستہ اسے کھولنے لگی۔ اندر سے بہت سارے کاغذات کا ایک پلندہ نکلا۔ اس کے اوپر ایک وکیل صاحب کا خط تھا۔ ساتھ ہی دوسرے بہت سے عدالتی کاغذات۔ جب مہرین نے ان کاغذات کو پڑھنے کے لئے سیدھا کیا تو ایک چھوٹا سا کاغذ نیچے قالین پر گر گیا۔ مہرین نے اس کاغذ کے پرزے کو اٹھایا تو یہ ایک پنسل سکیچ تھا۔ مہرین آراء کا لندن برج کے بیک گراؤنڈ میں مسکراتا ہوا چہرہ۔

مہرین چند لمحے اس ننھے سے سکیچ کو دیکھتی رہی اور پھر شفاف موتیوں کی لڑی اس کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر تیرنے لگی۔

کاغذات اور وکیل صاحب کے خط کے مطابق مہرین آراء علی جمال کی کروڑوں کی جائیداد کی اب واحد مالکہ تھی۔علی نے مرنے سے پہلے ساری جائیداد مہرین آراء کے نام گفٹ کر دی تھی۔

راج دُوت

اکرام نے زور سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور باہر گلی میں نکل آیا۔ ''ہونہہ! اکرام الدین احمد خان......'' وہ دانت پیستے ہوئے بڑبڑایا۔ لیکن جب بارش کی زوردار پھوار اس کے غصّہ سے لال بھبھوکا چہرے پر پڑی تو اسے اور غصّہ آیا اور اس نے زور سے ہوا میں تھوک دیا۔ پھر اس نے پھرتی سے دوبارہ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا لیکن دروازہ اب اندر سے خود بخود مقفل ہو چکا تھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور واپسی کا راستہ مفقود ہو گیا تھا۔ اکرام چند لمحے تو خاموش کھڑا رہا۔ پھر گلی میں قدرے باہر نکلے ہوئے چھجوں کی اوڑھ میں جلدی جلدی باہر سڑک پر نکل آیا اور نکڑ پر کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے؟

اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اسکول سے گھر پہنچنے پر امّاں نے اسے ایک طرف

لے جا کر آہستہ سے کہا ''کامو، ابھی تم انتظار کرو۔ میرا کام ایک آدھ گھنٹہ میں ختم ہو
جائے گا اور پھر بی بی جان کھانا دیں گی۔ اور پھر ہم مل کر کھائیں۔'' یہ سنتے ہی اکرام
کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ ایک تو امّاں گھر سے نکلتے ہوئے چائے
کے ساتھ رات کی باسی روٹی کا ایک آدھ حصّہ تھما دیتی تھیں جو پل بھر میں ختم ہو جاتا
تھا۔ دوسرے دوپہر تک بی بی جان کے گھر کے کام کرتے کرتے امّاں کو کبھی وقت پر
روٹی ملی نہ ہی چھٹی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اکرام اسکول سے تقریباً آدھ گھنٹہ کی مسافت طے
کر کے جب پیدل حویلی پہنچتا تو اس کا بھوک سے برا حال ہوتا لیکن یہاں تو ہمیشہ کوئی
نہ کوئی امّاں کو مسئلہ درپیش ہوتا اور عموماً اسے چند گھنٹے اور انتظار کرنا پڑتا۔ لیکن آج تو حد
ہو گئی تھی۔ نہ تو امّاں نے خود ناشتہ کیا تھا نہ ہی اکرام کو کچھ کھانے کو دیا تھا۔ صرف چائے
کا کپ اور چند پاپے دیتے ہوئے کہنے لگیں:

''کامو، تم تو میرے اکرام الدین احمد خان ہو۔ دیکھنا جب تم بڑے ہو جاؤ گے
اس طرح کی سفید حویلی کے مالک ہو گے اور لوگ تمہیں بہت عزت دیں گے اور تم
سب کے لئے اکرام الدین احمد خان بن جاؤ گے۔''

پل بھر کے لئے تو اکرام خیالوں کی حسین وادی میں کہیں کھو جاتا لیکن اگلے ہی
لمحے وہ حقیقت کی دنیا میں واپس آ جاتا۔ جہاں صرف بھوک اس کا استقبال کرتی۔

انہی خیالوں میں غلطاں اکرام سڑک پر خالی آنکھوں سے آتے جاتے کاروں
میں سوار اور پیدل لوگوں کو دیکھتا رہا۔ پھر سڑک کے کنارے کھڑے پانی میں شڑپ
شڑپ کرتے ہوئے کونے والے ٹی سٹال پر رک گیا۔

یوں تو موہن ٹی اسٹال یہاں برسوں سے آباد تھا اور آس پاس کے دکانداروں

اورراہ چلتے مسافروں کے لئے تپتی دھوپ میں ایک عارضی جنت کانعم البدل تھا۔ گاؤں جانے والے تقریباً ہر مسافر کے لئے یہی چوک قصبہ کا آخری اسٹاپ تھا۔لہٰذا قصبہ سے خریداری کر کے واپس جانے والے ایک آدھ دفعہ توضرور موہن ٹی اسٹال پر رکتے اور کچھ نہ کچھ ٹھنڈا یا چائے وغیرہ پیتے۔

تقسیم ہند سے پہلے اس کا مالک موہن نامی ایک ہندو تھا۔لیکن تقسیم کے بعد بشیرا ہی اس کا مالک تھا۔اس نے کئی بار موہن ٹی اسٹال کا نام بدلنے کی کوشش کی اور ایک آدھ بار تو باقاعدہ پاکستان ٹی اسٹال رکھ دیا۔لیکن نہ جانے کیوں لوگ اسے موہن ٹی اسٹال ہی پکارتے رہے۔لہٰذا بشیرے نے نام بدلنے کی اپنی سی ناکام کوششیں ترک کردی تھیں۔

اکرام دھوپ اور بارش سے بچنے کے لئے موہن ٹی اسٹال کے آگے ایستادہ سائبان کے نیچے سرک آیا تھا۔قمیص کے بازو سے اس نے اپنے چہرے سے پانی کے قطرے صاف کئے اور ٹی اسٹال کے سامنے رکھی ہوئی بنچوں پر ایک خالی جگہ پر بشیرے سے نظریں چراتے ہوئے دور سکڑ کر بیٹھ گیا۔

دراصل بشیرا ہمیشہ بچوں کو یہاں بیٹھنے سے منع کر دیا کرتا تھا۔نہ جانے کیوں اسے بچوں کی شرارتیں اور کھی کھی کرتے چہرے ناپسند تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ بشیرا اس وقت کافی مصروف تھا اور چائے کے کپ اور ٹھنڈی بوتلیں اپنے سامنے لکڑی کے کاؤنٹر پر دھڑا دھڑ رکھے جارہا تھا اور ساتھ ہی آواز لگا دیتا۔دو کپ چائے۔دو کیک پیس۔دو پیپسی کولا۔ایک چائے ایک نان وغیرہ وغیرہ۔یوں آرڈرر دینے والے حضرات جھٹ سے آگے بڑھ کر رقم ادا کرتے اور اپنی چائے وغیرہ اٹھا کر ایک طرف

بنچ پر بیٹھ کر پینے میں مصروف ہو جاتے۔

بہرحال اکرام اب اتنا چھوٹا بچہ بھی نہ تھا۔ پانچویں جماعت میں اسکول کا ہونہار طالب علم تھا۔ بظاہر تو بنچ کے آخری کونے پر بیٹھ کر وہ قدرے مطمئن ہو گیا تھا لیکن یہاں لوگوں کو کھاتے پیتے دیکھ کر اس کی بھوک میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ امّاں سے ناراضگی اور وقتی غصّہ لوگوں کو کھاتے پیتے دیکھ کر آہستہ آہستہ نفرت میں بدلنے لگا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اتنے میں بشیرے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''اوئے چھوٹے.... تمہیں کیا چاہئے۔''

اکرام نے تاسف سے اسے دیکھا اور کہا ابھی بتاتا ہوں۔ اور پھر خاموشی سے مزید سکڑ کر بیٹھ گیا۔ بھوک سے اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے شروع ہو گئے تھے اور چہرے کے تاثرات میں کھچاؤ نظر آنے لگا۔ اکرام کو یوں لگا اگر اسے کچھ دیر اور کھانے کو نہ ملا تو شاید وہ بے ہوش ہو جائے۔ اس نے اپنی ٹانگوں میں کمزوری سی محسوس کی۔ اتنے میں سامنے بیٹھے ہوئے چائے اور کیک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے چند لوگوں میں سے ایک نے ہنستے ہوئے دوسرے سے کہا ''استاد جی کمال کے کیک پیس ہیں۔ اور چائے بھی عمدہ ہے۔ مزہ آ گیا۔'' پھر اکرام کی طرف دیکھتے ہوئے درشت لہجہ میں کہا ''اوئے، تم کیا ندیدوں کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہے ہو، چلو اپنا کام کرو۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے یہ بھوکے ننگے لوگ فقیروں کی طرح سامنے آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔'' وہ شخص منہ میں بڑبڑانے لگا۔

دوسرے نے کہا ''چلو چھوڑو یار.... ان ازلی فقیروں کو اور جلدی سے چائے ختم کرو۔ بس نکلنے والی ہے۔''

بھوک اور غصّہ سے اکرام کا پہلے ہی برا حال تھا لیکن ان باتوں نے تو جلتی پر تیل کا کام کیا اور اکرام ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن نقاہت اتنی شدید تھی کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ سامنے والے بنچ سے ٹکرا گیا لیکن پھر ایک شخص سہارا دیتے ہوئے اسے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی مدد کرنے لگا۔ اچانک اس کی نظر اس شخص کی نیلی قمیص کی بغلی جیب پر پڑی جہاں سے بڑے بڑے نوٹ باہر جھانک رہے تھے۔ اگر اکرام ان نوٹوں کو نہ سنبھالتا تو وہ بہرحال چند لمحوں میں جیب سے باہر گرنے ہی والے تھے۔ اکرام نے آہستگی سے کچھ کہنا چاہا تو اس شخص نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا اور پھر جلدی سے دوسری طرف مڑ گیا۔

اکرام کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ نقاہت کے باوجود اس نے اپنی توانائی مجتمع کی اور سینہ پھلائے بشیرے کے کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ شدت بھوک میں ایک ساتھ دو کپ چائے اور دو کیک پیس کا آرڈر دے دیا۔ آرڈر دیتے ہوئے اس نے کاؤنٹر کی اوڑھ میں اپنی مٹھی کھول کر دیکھی تو ایک ساتھ کئی چھوٹے بڑے نوٹ سامنے لہرائے۔ اچانک اکرام نے محسوس کیا کہ امّاں اس کے پیچھے کھڑی ہے اور اسے آواز دے رہی ہے۔ اکرام نے مڑ کر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ بشیرے کو پیسے دینے کے لئے ایک بڑا نوٹ اس کی طرف بڑھایا تو امّاں نے کہا ''کامو، تم ایسے تو نہ تھے۔ چلو واپس گھر آؤ۔ کھانا تیار ہے۔''

اکرام نے گڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن امّاں کہیں دور دور تک نہ تھی۔ اس نے اسے اپنا واہمہ سمجھا اور بشیرے سے جلدی سے اپنی چائے اور کیک وصول کر کے بنچ پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ ابھی اکرام نے اپنی چائے کا آخری گھونٹ ہی پیا تھا کہ دو مضبوط

ہاتھوں نے اسے جکڑ لیا۔ سامنے ایک پولیس والا کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ نیلی قمیص والا شخص کھڑا تھا۔

انہیں دیکھ کر اکرام کی آنکھوں میں خوف سے اندھیرا چھا گیا۔ بہت سارے لوگوں کی ملی جلی آوازیں اس کے کانوں میں آ رہی تھیں۔ اور چاروں طرف ایک شور سا مچ گیا تھا ''یہی ہے، یہی ہے۔''

اچانک ایک گرجدار آواز نے اکرام کو زور سے پکارا:

''قیدی نمبر 1345، تم خاموش کیوں ہو، بولتے نہیں۔''

یہ جیلر صاحب تھے جو اکرام الدین احمد خان کے جیل کے اندر اچھے رویے کی وجہ سے اس پر اچھے خاصے مہربان تھے اور اس کا کندھا پکڑ کر زور زور سے اسے پکار رہے تھے۔

اکرام نے خاموشی سے اپنی آنکھیں کھولیں اور جیلر صاحب کی طرف دیکھا۔ جیلر صاحب کو اس کی آنکھوں میں ستارے نظر آئے۔ انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شفقت سے کہا ''دیکھو اکرام، آج تم جیل سے رہا ہو گئے ہو۔ جاؤ اپنی نئی دنیا آباد کرو۔''

اکرام خاموشی سے اٹھا اور اپنی جھلملاتی آنکھوں سے جیلر صاحب کی طرف دیکھا۔ جیلر صاحب نے آہستگی سے اپنا سر ہلا یا۔

اکرام اپنی چھوٹی سی گٹھڑی سنبھالے جیل سے باہر نکل آیا۔ اسے شدید بھوک لگ رہی تھی اور بھوک میں نہ جانے اسے امّاں کیوں یاد آ رہی تھی۔

خوشی

اگر آپ شعوری طور پر انتہائی چوکنے انسان ہیں اور جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہو اور وہ حقیقت پر مبنی نہ ہو پھر بھی اس کا آپ پر بہت اثر ہوگا چونکہ اس کے برعکس دوسرا متبادل منظر آپ کو دکھایا ہی نہیں جا رہا ہے تو آپ لامحالہ طور پر یہ یقین کر لیں گے کہ جو کچھ آپ نے دیکھا اس میں کسی قدر سچائی اور حقیقت تو ضرور ہوگی۔

یوں تو زندگی میں ایسے واقعات اکثر رونما ہوتے ہیں جو انسان کی پوری کی پوری ہیئت کو بدل جاتے ہیں اور آپ ایک بے بس انسان کی طرح اسے ایسے قبول کرتے ہیں جس طرح ریل گاڑی میں آنے والے مسافر کو آپ جانے انجانے میں جگہ میسر نہ ہونے پر بھی کچھ سکڑ کر جگہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لاشعوری طور پر ایک ایسا عمل ہے جسے آپ کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔ خوش آمدید! اخلاقی دباؤ! یا

فطری تقاضا...... بہر حال اس بحث میں الجھے بغیر ہی ہم آگے چلتے ہیں۔

شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ میں اپنے دفتر سے نکلا تو بہت سارے گھر کے کام ذہن پر سوار تھے۔ میرا تبادلہ یہاں نیا نیا ہوا تھا اور ابھی تک میں پوری طرح سیٹل بھی نہیں ہوا تھا۔ ایک اچھے سے علاقہ میں گھر تو لے لیا تھا لیکن گھر والی کا ازلی انتظار ابھی باقی تھا۔ شام کو کیا کھانا ہے کیا پکانا ہے ابھی اسی گھن چکر میں شام گزرتی تھی۔ انہی سوچوں میں مصروف آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے اپنی کار میں سٹیرنگ ویل پر انگلیوں سے موسیقی کی دھن گنگنا رہا تھا کہ اچانک ایک خاتون گاڑی کے سامنے آ گئیں۔ میں نے فوراً بریک لگائے تاہم میری گاڑی سے ہلکے سے ٹکرانے والی خاتون کو سڑک پر گرتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ غلطی انہی کی ہے۔ میں نے اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لئے گاڑی کو فوراً ایک طرف کھڑا کیا اور جلدی سے نیچے اترا تا کہ اسے سہارا دے سکوں۔ خاتون کو گرتے دیکھ کر بہت سے لوگ فوراً ہی اسے سڑک سے اٹھانے اور سہارا دینے کے لئے اس کے آس پاس میرے گاڑی سے اترتے اترتے جمع ہو چکے تھے۔ خاتون بہر حال بغیر کسی سہارے کے خود کھڑی ہو چکی تھیں۔ ان کے چہرے پر کچھ ندامت اور کچھ شرمندگی کے آثار نمایاں تھے۔ میں بھی اپنے تئیں کافی شرمندہ تھا تاہم ہمت کر کے خاتون کے قریب پہنچا اور انہیں پوچھا کہ آپ ٹھیک تو ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتیں کچھ لوگوں نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ گاڑی، امارت اور لاپروائی سے ڈرائیونگ کے تیر برسنا شروع ہو گئے۔ ایک آدھ نے تو مجھ پر ہاتھ اٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تاہم میرا جثہ، قد اور لباس مانع آ گیا اور میری چمکتی ہوئی آنکھوں نے اسے شاید روک دیا تھا۔ میرے اس طرح دیکھنے پر اور

لوگ بھی قدرے پیچھے ہو گئے۔ میں خاتون کی طرف متوجہ ہوا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ خاتون خاصی خوبصورت تھیں اور صاف ستھری شلوار قمیص اور تقریباً نئے ڈیزائن کے سینڈل میں ملبوس تھیں۔ بغل میں ایک بیگ دبا تھا، بال سلیقے سے بنائے ہوئے تھے۔ گلہ میں ڈوپٹہ نما ایک چیز سامنے سینے کو آدھا ڈھانپ کر اسے اور نمایاں کر رہی تھی۔ حلیے سے کسی دفتر کی لگتی تھیں۔ میرے معافی مانگنے پر کچھ کسمسائیں لیکن پھر اعتماد بحال کرتے ہوئے کہنے لگیں شکر ہے کہ آپ گاڑی آہستہ چلا رہے تھے ورنہ میں نے تو مرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

یہ سن کر آس پاس کا مجمع تو اپنی اپنی راہ لگا اور میں نے دل میں شکر کا کلمہ پڑھا ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اب اکیلی خاتون کو ہینڈل کرنا زیادہ آسان تھا۔ میں نے دوبارہ معافی مانگی اور اپنے لائق کوئی خدمت کرنے کو کہا، انہوں نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور ایک ادا سے کہنے لگیں، معافی تو مجھے مانگنی ہے میری وجہ سے آپ تکلیف میں آئے۔

خاتون کے ان الفاظ نے مجھ پر گویا ایک جادو کر دیا۔

میں نے خیالوں میں اپنی نئی دنیا فوراً بسانی شروع کر دی۔ جب انسان اپنی تنہائیوں کا ساتھی ڈھونڈ رہا ہو تب عام سادہ سی خاتون بھی کوہ قاف کی پری ہی لگتی ہے جبکہ اس کیس میں تو خاتون ٹھیک ٹھاک خوبصورت تھیں۔ میں عام حالات میں قدرے بے صبرا واقع ہوا ہوں تاہم اتنے سنجیدہ پلان میں کچھ احتیاط کرنا ضروری تھی۔ یہ سوچ کر میں نے اس خاتون کو ایسا کوئی عندیہ نہ دیا بلکہ خود کو حسبِ معمول حالات کی لہروں پر چھوڑ دیا۔

خاتون نے مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر کہا ''اگر آپ مصروف ہیں تو میں چلتی

ہوں''، یہ سن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ مجھے یوں لگا کہ میری دنیا ایک دم میرے قریب آ کر سمندر کی بڑی لہر کی طرح پیچھے جانے لگی ہے۔ میں فوراً بولا''اوہ معاف کیجئے آپ کچھ کہہ رہی تھیں''

وہ مسکر کر بولیں:

''جی ہاں !اگر زحمت نہ ہو تو مجھے اگلے چوک میں ویو ہسپتال پر ڈراپ کر دیں''

زہے نصیب......میں نے دل میں کہا اور بولا''کیوں نہیں ،آیئے'' اور ہم دونوں کار کی طرف چل پڑے۔

خاتون کے لئے میں نے اگلا دروازہ کھولا اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ مسکرا کر اپنی سیٹ میں دھنس گئیں۔ میں نے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور اپنی سیٹ سنبھالی۔ میرا جی چاہا کہ یہ لمحے رک جائیں اور ہم اسی طرح صدیوں ایک دوسرے کے پہلو میں اپنے اپنے بدن کی خوشبو پھیلاتے رہیں اور لطف اندوز ہوتے رہیں۔

''چلیں؟'' میں نے دانستہ مسکرا کر پوچھا تو وہ بھی جواب میں مسکرا دیں۔ ان کی آنکھوں میں شرارت دیکھ کر مجھے لگا کہ میرا کیا یہاں تو بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر اپنی خوش بختی پر قدرے نازاں ہوا۔

اگلے چوک تک کا فاصلہ شاید چار پانچ منٹ کا ہی تھا۔ چوک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے خاتون سے پوچھا کہ آپ کہاں اتریں گی۔

وہ بولیں''بس ہسپتال سے ذرا آگے، یہاں ہسپتال پر اترو تو لوگ دیکھتے ہیں اور باتیں بناتے ہیں''۔

ہم آہستہ آہستہ چلتے ہسپتال سے آگے آ گئے۔ میں نے کہا''جہاں رکنا ہو تو

مجھے بتادیں“

وہ بولیں”ذرااورآگے“

میں نے دیکھا آگے تو صرف درختوں کا جھنڈ ہےاور جگہ قدرے ویران ہے، میں نےمسکرا کر پوچھا”بس یہاں؟“

میری مسکراہٹ کے جواب میں خاتون کے چہرے پر درشتگی آ چکی تھی۔ اس نے کہا”جو کچھ تمہاری جیب میں ہےفوراً نکال دو ورنہ میں یہ شور مچادوں گی کہ میری عزت پرحملہ ہواہے“۔

یہ سن کر میں حواس باختہ ہوگیا، اتنے میں اس عورت نے بیٹھے بیٹھے مجھ پر گرکر اپنے دائیں ہاتھ کو اپنے ہونٹوں پر مسل کر اپنی لپ اسٹک کو ایک دم تہس نہس کر دیا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا اس کا کیا مطلب ہوتا ہےلیکن میں نے حواس کو قابو میں رکھا اور ایک زوردار دھکا دے کر اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور فوراًدروازہ کھول کر باہر نکلا اور گاڑی کی دوسری طرف گیا تاکہ اس عورت کو باہر نکالا جائے۔ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر میں نے اسے ایک بازاری قسم کی گالی دی اور کچھ نوٹ اس کی طرف اچھال دیئے اور جونہی وہ ان نوٹوں پر جھکی میں نے پوری طاقت سے اسے باہر نکال کھینچا اور دوبارہ سڑک بوس کر دیا۔ ایک دفعہ پھر ہمارے چاروں طرف لوگ جمع ہو چکے تھے۔ میں واپس گاڑی کے اندر آیا اور ایکسیلیٹر پر پورا پاؤں دبا دیا۔ اپنے خوابوں کو چکنا چور ہوتے ہوئے دیکھ کر زندگی میں پہلی دفعہ مجھے دلی خوشی ہوئی۔

☆☆☆☆☆

مارشل لاء

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اپریل 83ء کی اوائل کی ایک یادگار اور حیران کن شام تھی۔ میں اپنی نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ امنگیں نہ صرف جوان تھیں بلکہ ان کے اندر پارہ نما پھیلاؤ اس قدر غالب آ چکا تھا کہ جہاں ذرا سی سہولت ملتی یہ پارہ اس طرف بہہ نکلتا۔

گریجویشن کرنے کے بعد میں نے اپنے چند دوستوں کے مشورہ سے شام کے لاء کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ چونکہ وکیل بننے کی دھن سر پہ سوار تھی لہٰذا والدین نے بھی کوئی مدافعت نہ کی۔ میں جب بھی وکیلوں کو کالا کوٹ پہنے ہوئے سرِ راہ دیکھتا ہمیشہ فلمی عدالتیں میرے چشم تصوّر سے ابھر کر حقیقت کا روپ دھار لیتیں اور انہیں عدالت کے سامنے جذباتی اور قانونی دلائل دیتے ہوئے دیکھتا جہاں بالآخر جج صاحب

یک جنبش قلم ایک فیصلہ سنا دیتے۔ ہیرو اور ہیروئن کا ملاپ ہوتا، ولن اپنے انجام کو پہنچتا اور سب راضی خوشی گھروں کو لوٹ جاتے۔

میری قانون اور قانونی بحث کے بارے میں اس سے زیادہ فہم نہ تھی۔ اتنا ضرور سنا تھا کہ قانون پڑھنے سے قانون دان بننے تک ایک طویل سفر انسان کو تھکا دیتا ہے۔ لیکن ہم تو تھے ہی خطروں کے کھلاڑی۔ ایک تو منہ زور جوانی دوسرے مارکسی خیالات نے بورژوائی طبقہ کے خلاف دماغ کے اندر ایک تلاطم برپا کر رکھا تھا جو تھمنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ یہ طے تھا کہ کچھ نہ کچھ پڑھنا ضروری ہے۔ لہٰذا اسی پس منظر میں ایڈونچر کے طور پر لاء کالج میں داخلہ لے لیا۔

وہ شام جس کا ذکر میں نے ابتدا میں کیا تھا یہ وہی شام تھی جب ہماری لاء کی پہلی کلاس ہونے جا رہی تھی۔

چونکہ کالج کے اوقات شام کے تھے لہٰذا مجھ جیسے بے شمار طالب علم وہی تھے جو صبح کہیں نہ کہیں نوکری کرتے اور شام کو اپنی پڑھائی کا اہتمام کرتے۔ سہ پہر تین بجے کلاس کا وقت تھا اور تقریباً پوری کلاس پونے تین بجے کے قریب لیکچر ہال میں جمع ہو چکی تھی۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں سن 83ء کا آغاز تھا، پورے ملک پر مارشل لاء اپنے عروج پر تھا۔ خوف کی ایک لہر ہر وقت ماحول کو سوگوار رکھتی تھی۔ دفتروں میں، کالجوں میں اور تو اور گھروں میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ ادھر آپ نے کوئی بات کی اور ادھر آپ پر کوڑوں کی بارش ہو جائے گی۔

بہر حال میں اپنی کلاس کی طرف آتا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ سب طالب علم پونے تین بجے لیکچر ہال میں جمع ہو چکے تھے۔ تقریباً چالیس سے اوپر کی کلاس تو ہو

گی۔ جب میں لیکچر ہال میں داخل ہوا تو پہلی نشستوں کی قطار میں چھ فوجی افسران اپنی فل یونیفارم میں ایک ساتھ پوری رو کو سنبھالے بیٹھے دکھائی دیئے۔ ان کے برابر دوسری طرف کی قطار میں ایک نشست خالی تھی۔ لہٰذا میں فوراً موقع غنیمت جانتے ہوئے اس پر بیٹھ گیا۔

کالج چونکہ نیا نیا تعمیر ہوا تھا لہٰذا اس کے لیکچر ہال بالکل ایک چھوٹے سائز کے تھیٹر ہال کی مانند تھے۔ سٹیج اور روسٹرم اور بڑا سا دیواری بلیک بورڈ ہمارے سامنے قدرے بلندی پر تھا اور اسی طرح ہمارے پیچھے بیٹھنے والے طالب علم اور طالبات قطار در قطار اوپر کی طرف بیٹھے تھے۔

خوشگوار حیرت تب ہوئی جب ہمارے کالج کے مشہور اور قانون کی دنیا میں جانے پہچانے بیرسٹر امجد علی ٹھیک تین بجے لیکچر ہال میں چند کاغذ تھامے داخل ہوئے۔ ان کے داخل ہوتے ہی تمام کلاس کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے داخل ہوتے ہی وہ کاغذ سب سے پہلے نظر آنے والے طالب علم کو تھما دیئے۔ اور حاضری کی ہدایت دیتے ہوئے تیز قدموں سے روسٹرم پر جا کھڑے ہوئے۔

روسٹرم پر پہنچ کر انہوں نے ایک طائرانہ نظر کلاس پر ڈالی تو چند فوجی افسران کو مکمل یونیفارم میں بیٹھے دیکھ کر قدرے ٹھٹکے اور انگلش میں مخاطب ہو کر کہا کہ اس سے پہلے کہ میں اپنا لیکچر شروع کروں میں چاہتا ہوں کہ سب طالب علم اپنا تعارف رسماً پیش کریں اور تعارف شروع کرنے کا اشارہ انہوں نے فوجی افسروں کی طرف کر دیا۔ ان چھ افسران میں چار تو چھوٹے افسران تھے اور دو سینئر رینک کے آفیسر تھے۔ شاید وہ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد وکالت میں اپنا کیریئر دیکھ رہے تھے۔

جب تعارف ختم ہوا تو بیرسٹر امجد علی نے اپنا لیکچر شروع کیا۔ میرے لئے بلکہ شاید ہم سب کے لئے پہلا اتفاق تھا کہ ہم مکمل، شائستہ اور روانی کے ساتھ انگریزی میں لیکچر سن رہے تھے۔ بیرسٹر امجد علی انتہائی زیرک قانون دان کی حیثیت سے مشہور تھے۔ انہوں نے جب کلاس میں بیٹھے فوجی نوجوانوں کو یونیفارم میں دیکھا تو میرا خیال ہے کہ ان کی رگِ قانون پھڑک اٹھی ہوگی۔ ایک تو مارشل لاء کا زمانہ، دوسرے قانون کی کلاس، تیسرے فوج کے افسران یونیفارم میں طالب علموں کی حیثیت سے اور چوتھے شاید دل کے کسی نہاں خانہ میں مارشل لاء کے خلاف بھڑاس نکالنے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع میسر نہ آتا۔ یہ سوچ کر انہوں نے اپنے آج کے لیکچر کے موضوع مارشل لاء کو جلی حروف میں بلیک بورڈ پر جا کر لکھ دیا۔ ایک جھٹکا سا تو ساری کلاس کو لگا لیکن یونیفارم میں ملبوس شاگرد سپاٹ چہرے لئے خاموش بیٹھے رہے۔

وضاحت انہوں نے یوں کی کہ چونکہ آج آپ کی پہلی کلاس ہے، قانون پڑھنے سے پہلے آپ کے لئے قانون کی بنیادی اساس کو جاننا بہت ضروری ہے۔ اور کتنے قسم کے قانون ہوتے ہیں مَیں آج تفصیل سے اس پر بات کروں گا۔ اور اس بحث کو ہم مارشل لاء سے شروع کریں گے۔ اور پھر آہستہ آہستہ انہوں نے قانون کی بنیادیں مارشل لاء کی لاش پر کھڑی کرنا شروع کر دیں۔

رفتہ رفتہ انہوں نے مارشل لاء کے ان پہلوؤں کو جو حقیقتاً اور عملاً فطری انصاف اور قانون کی نفی کرتے تھے، کو پوری طرح بے نقاب کر دیا۔ دلائل کے دریا کیا بہہ رہے تھے کہ فوجی افسران کے چہروں کے رنگ بدلنا شروع ہو گئے۔ قانونی نکات اور دلائل اس قدر خوبصورت اور منطقی تھے کہ کوئی ذی روح انسان معاشرے کے اندر

رہنے کی تمنا کو دل میں لئے اس سے روگردانی نہیں کرسکتا تھا۔ فطرت اور انسانی قوانین کا آپس میں ربط، انسان کی بہتری، تقدس اور ترقی کے عوامل کو لحظہ بہ لحظہ قانون کی چھتری تلے مارشل لاء کو روندتے ہوئے پروفیسر صاحب اس موڑ پر آنکلے کہ بار بار پہلو بدلتے فوجی افسران کے لئے شاید مزید لیکچر سننا محال ہوگیا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں مارشل لاء کی اتنی تذلیل دیکھی نہ ہوگی۔

بالآخر ایک فوجی نے کھڑے ہونے کی جسارت کرلی اور پروفیسر کی طرف سوال کرنے کا اشارہ کیا۔ ہم سب نے مڑ کر فوجی نوجوان کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تقریباً سرخ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ بولتا تو اس کے الفاظ اس کا ساتھ نہ دیتے۔ غصّہ کی آندھی چہرے پر نمایاں تھی۔

ہم سب سہم سے گئے۔ اور میں نے تو چشم تصوّر میں بیرسٹر امجد علی کو ننگ دھڑنگ ٹکٹکی پر بندھے سو کوڑے تک کھاتے دیکھ لیا۔ لیکن انہوں نے جس جواں مردی کے ساتھ آج مارشل لاء کو للتاڑا تھا کہ ہم سب ان کے لئے سو سو کوڑے کھانے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ یہ بات میری کلاس فیلو نیلم نے مجھے بعد میں بتائی۔

فوجی افسر کے کھڑے ہونے اور سوال کرنے کے اشارہ کرنے پر ہال میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ بیرسٹر صاحب نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ لیکن وہ بدستور کھڑے رہے بلکہ ان کے ساتھ دوسرے فوجی بھی ایک جھٹکا لے کر کھڑے ہو گئے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جنگ شروع ہو چکی ہے اور صرف فائر کرنے کا آرڈر دینا باقی ہے۔ اسی اثناء میں امجد علی نے اپنی بات مکمل کی اور پھر دھیرے سے روسٹرم سے باہر نکل کر سامنے آ گئے اور کہنے لگے میں آپ کو بحیثیت پروفیسر حکم دیتا ہوں کہ تشریف

رکھیں۔لیکچرختم ہونے کے بعدآپ کوسوال کرنے کاپوراحق دوں گا۔

اتنے میں باہرکوریڈور میں گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔لیکچرکا وقت ختم ہو چکا تھا۔ پروفیسرصاحب نے فوجی افسران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کیاسوال کرناچاہتے ہیں۔دیکھئے،یہ قانون کی کلاس ہےاورآپ قانون پڑھنے کے لئے آئے ہیں۔آج ہم نے مارشل لاء کے خلاف قانونی دلائل دیئے ہیں۔کل میں مارشل لاء کی حمایت میں قانونی دلائل دوں گااوراس میں آپ کوبھی زحمت دوں گا۔اگرآپ سمجھتے ہیں کہ مارشل لاءایک انسان دوست قانون ہےتوآپ اپنے دلائل میرےاوراپنے باقی طالب علم ساتھیوں کے سامنے رکھیے گا۔آپ کا قانونی حق ہے کہ دلائل میں اپنی آواز ہم سب تک پہنچائیں۔یہ کہہ کرانہوں نے اپنے حاضری کے صفحات سنبھالےاورحیرت زدہ کلاس سے باہر چلے گئے۔

جلتے فرشتے

نینی نے اپنے تمام سکّوں کو مٹھی میں تھام کر بند کر لیا اور مسکراتے ہوئے اپنی امّی کی طرف دیکھا۔ جواب میں نینی کی امّی نے اسے ہلکے سے آنکھ میچ کر اشارہ کیا کہ وہ اسے چھپا لے۔ عائشہ ہمیشہ سے بچوں کو پیار کرنے والی خاتون تھی اور پھر نینی تو اس کی اپنی بیٹی تھی جسے اس نے بہت چاہتوں کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ یہ سکے دراصل نینی کے صبح جلدی اٹھنے کے عوض انعام میں عائشہ نے اسے دیئے تھے۔ وعدہ تو کل شام ہی ہو گیا تھا جب نینی نے کہا تھا کہ امّی کل صبح میں خود جاگ جاؤں گی اور آپ کو تکلیف نہ دوں گی۔ اور وہی ہوا۔ نینی صبح چھ بجے ہی جاگ گئی تھی۔ اور کمال یہ کیا کہ خود ہی اسکول کے لئے تیار ہو گئی۔

سات سالہ نینی دوسری جماعت میں تھی اور طالبات کے ماڈل پرائمری اسکول

میں جو گاؤں سے تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، پڑھتی تھی۔ اور صبح سویرے ساڑھے چھ بجے اسکول کی ایک پرائیویٹ وین اس لے جانے کے لئے آجایا کرتی تھی۔ وہی وین اسے واپس بھی لاتی تھی۔

نینی اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے ابّا یوں تو گاؤں کے چھوٹے سے زمیندار تھے۔لیکن زمینداری کا کام اس کے دادا اور چچا وغیرہ کرتے تھے۔ نینی کے ابّا تو شہر میں دفتر جایا کرتے تھے۔ جہاں سے کبھی وہ روز واپس آجاتے اور کبھی چند دن وہیں رہ جاتے۔

دادا نے انہیں ایک الگ پورشن دے رکھا تھا جہاں یہ ہنسی خوشی اپنے دن گزار رہے تھے۔

اتنے میں باہر دور کہیں گاڑی کے ہارن کی آواز آئی تو نینی نے ایک دم اپنا اسکول کا بیگ اٹھالیا۔ عائشہ نے اسے دیکھا اور بولیں ''ابھی وین بہت دور ہے۔ آؤ جب تک تم میرے پاس بیٹھو۔''

نینی نے اسکول بیگ واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا:

''امّی، آج اسکول جانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔''

''لو، کیوں، آج تو تم نے نئی یونیفارم پہنی ہے اور اپنا وعدہ پورے کرنے پر انعام بھی حاصل کیا ہے۔ آج تو میری بیٹی پری لگ رہی ہے۔ آج ہی تو اسکول جانے کا دن ہے'' اس کی امّی نے مسکرا کر جواب دیا۔ اور کھینچ کر نینی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ نہ جانے عائشہ کو ایسا لگا کہ نینی کے اندر سے ٹھنڈی ٹھنڈی کوئی چیز اس کی روح میں اتر رہی ہے۔ عائشہ نے نیچے جھک کر نینی کے چہرے کو غور سے دیکھا اور اس کے گال پر

پیار کیا۔

نہ جانے کیوں آج دونوں ماں بیٹیوں کو ایک دوسرے پر بہت پیار آ رہا تھا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے'' عائشہ نے مسکرا کر نینی سے پوچھا۔

''ہاں ہاں، امّی طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن آپ سے دور ہونے کو دل نہیں چاہ رہا ہے'' نینی معصومیت سے بولی۔

اتنے میں دروازے پر وین کے ہارن کی زوردار آواز آئی اور عائشہ نینی کا ہاتھ پکڑ کر باہر تک لے آئی۔

وین سامنے کھڑی تھی۔ ڈرائیور اپنی سیٹ سے باہر نکلا اور گھوم کر سامنے آ کر زور سے وین کا دروازہ کھولا۔

''بھائی آپ وین کا دروازہ ٹھیک کیوں نہیں کروا لیتے۔''

عائشہ نے نینی کو اندر اسکول بیگ سمیت دھکیلتے ہوئے کہا۔

''باجی میں تو کہہ کہہ کر تھک گیا ہوں۔ اسکول والے میری سنتے ہی کہاں ہیں۔''

اندر بیٹھی ہوئی بچوں کی ایک ٹیچر کلثوم بھی اسی وین میں سفر کرتی تھیں۔ اس نے عائشہ کی طرف دیکھا اور مایوسی سے سر ہلا دیا۔ اتنے میں نینی اندر ایک سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ ڈرائیور نے ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ وین کا دروازہ بند کیا اور پھر ایک تار کے ساتھ اس کے ہینڈل کو مضبوط کر کے باندھ دیا تا کہ چلتی وین میں دروازہ نہ کھل جائے اور جا کر وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور وین آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔

نینی نے یوں تو مسکراہٹ کے ساتھ اپنی امّی کو خدا حافظ کہا لیکن نہ جانے کیوں اس کے چہرے پر یاسیت کے گہرے سائے تھے۔ ساتھ بیٹھے بچوں میں سے پنکی نے

شرارت کی اور آہستہ سے نینی کے بازو پر چٹکی۔اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''دکھاؤ مٹھی میں کیا ہے'' پنکی نے شرارت سے اس کا دامن کھینچا۔

''ارے چھوڑو، آج خوب مزے کریں گے۔ پیسے ہیں ماما نے دیئے ہیں۔''

نینی نے جھٹکے سے مٹھی کھولی اور پنکی کی طرف پیسے لہرائے اور فوراً بند کر لی۔

''ہوں تو آج خوب مزے آئیں گے'' پنکی نے ایک اور چٹکی بھری۔تو نینی نے الٹا ہاتھ اس کے کندھے پر مارا اور دونوں ہنس پڑیں۔شاہد، جواد، اسلم اور فرحانہ اس کے کلاس فیلو تھے اور قدرے پیچھے بیٹھے تھے۔ ہم عمر ہونے کے ناطے اور وین کے ساتھی ہونے کی وجہ سے سب آپس میں نہ صرف متعارف تھے بلکہ دوستوں سے بڑھ کر تھے۔ تاہم لڑکیوں نے اپنا الگ گروپ بنا رکھا تھا۔لیکن دوستی سب سے تھی۔ بالکل آخری سیٹوں پر بیٹھے لڑکے آپس میں تیز تیز ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کر رہے تھے اور وین ہواؤں کے دوش پر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی کہ اچانک اسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کی طرف کی کھڑکی کھولنے کی کوشش کی۔ شاہد نے اسے ڈانٹا اور کہا کیوں مس صاحبہ سے مار کھانی ہے۔ بچوں کے شور پر کلثوم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ساری وین میں ایک دم شور تھم گیا۔کلثوم نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں شور نہ کرنے پر تنبیہ کی اور پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

چند ہی لمحوں میں اسلم نے پھر کھڑکی کھولنے کی کوشش کی تو ساتھ بیٹھے شاہد نے پوچھا:

''یار تمہارا کیا مسئلہ ہے'' بار بار کھڑکی کیوں کھولنے کی کوشش کر رہے ہو۔

''شاہد، کیا تمہیں کوئی بُو محسوس نہیں ہو رہی ہے؟''

''ہاں، محسوس تو ہو رہی ہے۔''

''کیا ہے یہ؟''

''مجھے کیا پتہ کیا ہے؟'' شاہد نے جھلا کر جواب دیا۔

جواد نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا'' یار یہ تو مجھے پٹرول کی بُو لگتی ہے۔''

''ہم جب بھی پٹرول پمپ جاتے ہیں تو ایسی ہی بُو آتی ہے۔''

''تم میڈم کو بتاؤ۔''

''تم خود بتاؤ، میں کیوں بتاؤں'' اسلم نے ڈرتے ہوئے کہا۔

جواد نے زور سے آواز لگائی اور کہا'' انکل یہاں پیچھے سے پٹرول کی بُو آرہی ہے۔''

کلثوم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بچے خاموش ہو گئے۔ کلثوم نے ڈرائیور سے کہا: بچے کہہ رہے ہیں کہ پٹرول کی بُو آرہی ہے۔

''جی ہاں میڈم، شریف صاحب پرنسپل صاحب نے پٹرول منگوایا ہے۔ دو کین ہیں اور دوسرا کین گاڑی کے لئے ہے جس کا ڈھکنا لیک کرتا ہے۔ اگر سی این جی ختم ہو گئی تو گاڑی پٹرول پر چلے گی۔ لہٰذا فالتو پٹرول گاڑی میں رکھا ہوا ہے۔ ممکن ہے اس کی بُو آرہی ہو گی بچوں کو۔'' پرنسپل شریف صاحب کا نام سن کر میڈم کلثوم کچھ سوچ کر خاموش ہو گئیں۔

اتنے میں بچوں کی کھسر پھسر کی آوازیں دوبارہ آنا شروع ہو گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اسلم نے مڑ کر اپنے پیچھے ونڈ سکرین سے باہر دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ ساتھ گزرنے والی ایک گدھا گاڑی والا زور زور سے ہاتھ ہلا کر کچھ اشارے کر رہا ہے۔ اسلم نے ساتھ بیٹھے شاہد کو کہنی ماری تو شاہد نے بھی پیچھے دیکھا تو اسے گاڑی بان ہاتھ ہلاتا ہوا نظر آیا۔

اتنے میں جواد نے زور سے کہا ''یار میری سیٹ گرم ہو رہی ہے۔''

اسلم نے ہاں سے ہاں ملائی اور نیچے کینوس کی سیٹ پر ہاتھ لگا کر کہا: یار میری سیٹ بھی گرم ہو رہی ہے۔ چند ہی لمحوں میں ان کی سیٹیں اتنی گرم ہو گئیں کہ ان پر بیٹھنا محال تھا۔ اسلم اور شاہد ہم آواز ہو کر چلائے۔ انکل، سیٹیں گرم ہو رہی ہیں۔ اتنے میں وین کا ڈرائیور اپنی رفتار کم کر چکا تھا۔ رفتار کم ہوتے ہی اچانک سیٹ کے نیچے سے ایک بڑا سا شعلہ وین کے اندر اوپر کی طرف لپکا۔

بچے گھبرا کر وین میں کھڑے ہو گئے۔ لیکن وین کی چھت چھوٹی ہونے کی وجہ سے پوری طرح کھڑے نہ ہو سکتے تھے۔ اور چلائے:

''انکل آگ لگ گئی ہے۔''

مس کلثوم نے فوراً بچوں کی طرف مڑ کر دیکھا تو شعلے بھڑک اٹھے تھے اور بچے چیخ رہے تھے۔ کلثوم نے فوراً ڈرائیور کو گاڑی روکنے کو کہا۔ لیکن جب تک گاڑی رکتی پچھلی سیٹوں پر بچے آگ کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ وین رکی اور ڈرائیور نے باہر کی طرف چھلانگ لگا دی۔ بجائے اس کے کہ ڈرائیور بچوں کے لئے وین کا دروازہ کھولتا وہ ایک طرف بھاگ نکلا۔

مس کلثوم نے گھبراہٹ میں آگے سیٹ پر بیٹھے بچوں کو کہا کہ وہ فوراً باہر کود جائیں اور اپنی پچھلی سیٹ پر بچوں کو کہا کہ کوشش کریں کہ دروازہ کھل جائے۔ بچوں نے مل کر زور لگایا لیکن دروازہ نہ کھلا۔ کلثوم نے اپنے پیچھے لگی ہوئی لوہے کی جالی کو زور زور سے جھٹکے دیئے کہ شاید وہ اپنی جگہ سے اکھڑ جائے تو بچوں کو اس ڈرائیور والے دروازہ سے باہر نکالا جائے۔ لیکن بے سود۔

اب پیچھے بیٹھے ہوئے تمام بچے ایک طرح سے بند وین میں محصور ہو کر آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔کلثوم نے اپنے دروازے سے باہر چھلانگ لگائی اور دوسری طرف گھوم کر دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔لیکن وین کا دروازہ اس قدر گرم ہو چکا تھا کہ اسے ہاتھ ہی نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

کلثوم پھر اپنے دروازے سے شعلوں بھری وین کے اندر داخل ہو گئی اور ایک زوردار جھٹکا جالی کو دیا۔شاید جلنے کی وجہ سے جالی کمزور ہو چکی تھی لہٰذا وہ اپنی جگہ سے اکھڑ گئی۔

کلثوم نے شور مچایا اور جلتے ہوئے بچوں کو کہا کہ کوشش کرو کہ اس طرف سے نکل آؤ۔ چند بچوں نے کوشش کی لیکن بے سود۔آگ کے شعلوں نے کلثوم کو بھی جکڑ لیا۔ لیکن وہ باہر نہ نکلی بلکہ اس نے اسی اثناء میں تین چار بچے اٹھا اٹھا کر باہر پھینک دیئے۔ اب آگ پوری طرح سے وین کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ باہر جمع ہونے والے لوگوں نے اینٹیں اور ڈنڈے مار مار کر وین کے شیشے توڑ دیئے تھے اور اندر پانی کی بالٹیاں انڈیلتے جا رہے تھے۔لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ بچوں کے چیخنے اور چلانے کی آوازیں اب مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔ نینی چیخ چیخ کر اپنی امّی کو پکار رہی تھی اور دیگر معصوم بچے اپنے حوصلے ہار چکے تھے اور موت کی بے رحم آغوش میں آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔

سسکیاں اپنی اکھڑی سانسوں سے شکست کھا کر معدوم ہو رہی تھیں۔کلثوم نے اپنے بچوں کو بچاتے ہوئے آگ کے شعلوں کو اپنا لیا تھا اور اب صرف اس کے ہولناک جلے ہوئے چہرے پر ایک آخری چیخ رک گئی تھی۔ وین کے اندر فرشتے جل

رہے تھے اور موت اپنی خوفناک مسکراہٹ سے ان کا استقبال کر رہی تھی۔ اگلے دن جب بچوں کے جلے ہوئے جسم پہچان کے آخری مرحلے سے گزرے تو عائشہ نے ایک ننھے بچے کے اوپر سے جب.... چادر ہٹائی تو وہ سکتے میں آگئی اور بے ہوش ہو کر اپنے شوہر کے ہاتھوں میں جھول گئی۔ اس ننھے فرشتے کی مٹھی اب تک بند تھی۔

منتخب انشائیے

کوئل کا خط

اے میری ہمزاد۔ میری دوست

زندگی نام ہے مسلسل کامیابیوں کا۔ جو درمیان میں چند ناکامیاں سامنے آتی ہیں انہیں اگر انسان روند ڈالے تو پھر بہاروں کے موسم کھل اٹھتے ہیں۔ پھول وہی جو نظر آئے۔ خوشبو وہی جو فضا کو معطر کر دے۔ لفظ وہی جو عمل کو ظاہر کریں۔ باقی صرف لفاظی رہ جاتی ہے۔

اور تم جانتی ہو میں ہمیشہ اپنی سوچوں میں گم رہنے والی ایک ایسی ہی داستان ہوں۔ خیالوں میں بنتے اور بگڑتے محلوں کو میں نے اپنے دل میں جگہ دی اور وہاں شیشے کے لاتعداد محل کھڑے کر دیئے۔ نئے محل آباد ہوتے گئے اور پچھلے محل برباد۔ لیکن میں خوش تو تھی۔

برسوں کی ریاضت اور صدیوں کی پیاس دونوں ندی کے دو کناروں کی طرح میرے اندر ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ کبھی ایک کنارے پر اور کبھی دوسرے کنارے پر

میں اپنی پرواز جاری رکھتی رہی۔

لیکن اب میں نے نئی بستی کی تلاش ترک کر دی ہے۔اس پرندے کی مانند جو دن بھر اپنے آب و دانہ کی تلاش میں نگر نگر اڑتا ہے اور پھر بالآخر تھک ہار کر اپنے ٹھکانے پر ہی جا نکلتا ہے۔

تم میرے لئے ہمیشہ نیک تمنائیں دل میں رکھتی تھیں سو تم سے اپنا حالِ دل کہہ رہی ہوں۔اب میں نئی بستی کی تلاش میں تھک کر اپنے ہی ایک پرانے گھروندے کو پھر سے آباد کرنے کی کوشش کروں گی۔لیکن اب بستی کے لوگ بدل چکے ہیں۔

ماضی کی طرح میری کوکتی آواز کے سحر میں مدہوش ہونے والے پنڈال میں رونق افزوں چند پرندے اب مجھے وہ توقیر کہاں دیں گے۔سوچتی ہوں کہ وہی کنارہ وہی درخت وہی شاخ جہاں ہم دونوں سہیلیاں بیٹھا کرتی تھیں، پر اپنا ڈیرہ جما لوں۔موسم بہار تو ہر سال آتا ہے شاید اب کی بار اس کی نظر کرم مجھ پر بھی ہو جائے اور بادِ صبا کے چند جھونکے میری جھولی لہرا دیں اور میں پھر ساون کی پھوار سے اپنی روح کو تروتازہ کرلوں۔

مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی اپنی پرواز جاری رکھی ہوگی اور کوکتی ہوئی دلوں کو موہ لینے والی آواز سے بیشتر بستیوں کے مکینوں کو اپنے سحر میں گرفتار رکھا ہوگا۔

لیکن یاد رکھنا اب زمانہ بدل چکا ہے۔لوگ پرندوں کی مدھر آوازیں سننے کے لئے ٹھہرتے نہیں، بادِ صبا کے ایک جھونکے کے لئے رکتے نہیں۔بستیوں میں پھیلے بھوک کے ننگ دھڑنگ بت اب دوسروں کی بوٹیاں نوچتے نوچتے بالآخر اپنی ہی بو باس کی سڑانڈ سے لبریز بوٹیاں نوچ لیتے ہیں۔لیکن تم اپنی پرواز سے کوتاہی نہ کرنا اپنی کوکتی ہوئی مدھر آواز کو کبھی خاموش نہ کرنا۔کہ زندگی یہی ہے۔

بجلی اور شاہ صاحب

معاملات تو ابھی بہت سارے حل طلب ہیں، یہ سوچ کر میں جھنجھلاہٹ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بجلی چلے جانے پر کچھ سوجھتا بھی تو نہیں۔ لیکن اب کیا کیا جائے۔ گرمی کی شدت نے بے حال کر دیا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور کام ابھی بے تحاشا کرنے لائق پڑا تھا۔

آج کی چھٹی، نو مور ورک۔

میں نے یہ سوچا اور دفتر سے باہر نکل آیا اور اپنی موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور نشاط پان کی راہ لی۔ میں جب بھی پریشان ہوتا ہوں میرا آخری ٹھکانہ نشاط بابو کی دوکان ہی ہوتا ہے۔ جہاں رنگ برنگے لوگ اپنے اپنے دو چار گروپس میں بٹے ہوئے، کرسیاں بچھائے اور سامنے چائے کے کپ دھرے، تازہ ترین ملکی سیاست اور قریبی سنیماؤں میں لگی فلموں پر تبصرے کرتے نظر آتے ہیں۔ دن ہو تو سائبان کے نیچے اور رات ہو تو کھلے آسمان کے نیچے یہ بے فکرے لوگ دنیا و مافیہا سے بظاہر بے خبر لیکن اپنے اندر

علمیت اور تہذیب کا ایک سمندر سنبھالے باتوں کے دریا بہا رہے ہوتے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جب گھر میں مجھے کوئی کام نہ ہو تو میں برابر میں صفیہ آنٹی کے دروازے پر دستک دے دیتا ہوں۔ صفیہ آنٹی یوں تو کبھی کالج وغیرہ میں شاعرہ رہ چکی ہیں اب ادھیڑ عمری میں بیوہ ہونے کے بعد زیادہ وقت اپنے گھر کے دروازے پر ہی گزارتی ہیں۔ کبھی اِس سے، کبھی اُس سے، یکے بعد دیگرے لوگ بدلتے رہتے ہیں لیکن صفیہ آنٹی وہیں دروازے کی بظاہر اوڑھ لئے آپ کو کھڑی ملیں گی۔ موضوع گفتگو ہمیشہ محلہ ہی رہا تا ہم جب میں گزرتا ہوا پکڑا جاؤں تو پھر میرے تو دو چار شعر ہی انہیں کافی ہوتے ہیں اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہیں رہتی۔ جب وہ اپنی رٹی رٹائی غزلیں پے در پے یوں ٹیلی پرنٹر کی طرح چھاپتی ہوئی تیزی سے یکے بعد دیگرے عرض کرتی ہیں تو میں صفیہ آنٹی کی جوانی کے دن اپنے خیالوں میں لے آتا ہوں تا کہ کچھ تو شاعری میں ندرت محسوس ہو۔ یوں میں کبھی اپنی ایک، کبھی دوسری ٹانگ پر کھڑے کھڑے ساکن اور جامد ہو جاتا ہوں لیکن کیا مجال کہ صفیہ آنٹی کے چہرے پر شاعری کے علاوہ کوئی اور تاثر ابھرے۔ ہاں البتہ یہ محفل زیادہ تر بجلی کے چلے جانے کے بعد اگر گلی میں اندھیر چھا جائے تو بادل نخواستہ برخاست کرنی پڑتی ہے۔

جب میں نشاط پان کے قریب پہنچا تو اپنے شاہ صاحب آہستہ آہستہ بوجھل قدموں کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے دل ہی دل میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگی اور اپنی موٹر سائیکل ان کے قریب لے جا کر روک دی۔ اگر نہ رکتا تو کل شام تک آدھے شہر میں اس افواہ کی زد میں ہوتا کہ چونکہ میں نے شاہ صاحب کا ادھار دینا تھا لہٰذا انہیں دیکھ کر ''دوڑ کی' لگا دی۔ شاہ صاحب نے مڑ کر دیکھا تو مسکرائے۔

ان کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ آج موڈ اچھا ہے۔ لگا تھا کہ انہیں بھی لوڈ شیڈنگ نے دفتر سے چھٹی دلا دی ہے ورنہ ملاقات پر پہلی بات ان کے منہ سے ہمیشہ ایک بھرپور مردانہ گالی کے طور پر ہی نکلتی تھی۔

بہرحال شاہ صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے پیچھے والی سیٹ پر براجمان ہوتے ہوئے حکم دیا کہ چلو۔

کہاں؟

یہ پوچھنے کی نہ مجھ میں تاب تھی نہ ہی جسارت۔ ورنہ طبع تفنن کے طور پر بھی وہ اگر دور دراز کسی گاؤں یا قصبہ کا نام لے لیتے جہاں ان کے دور کے رشتہ دار رہتے تھے تو میری ذات تو فنا فی اللہ ہو جاتی۔ لہٰذا میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور موٹر سائیکل بلا ارادہ ٹھنڈی سڑک کی طرف موڑ دی۔ ٹھنڈی سڑک پر پہنچے تو شاہ صاحب نے ایک نئی اور تازہ گالی عین میرے کان کے اندر داغی۔ میں نے جسارت کی اور پوچھا آقا مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے۔ بولے اوئے تو نے دیکھا نہیں، یہاں.... پھر گالی! بجلی کتنی وافر مقدار میں میسر ہے۔ اور اس کے بعد اتنے قہقہے لگائے کہ راہ چلتے لوگ گھبراہٹ میں راستہ چھوڑ دیتے۔ کچھ دیر تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے رہے لیکن جب شام کی قدرے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ان کے دماغ میں کچھ بوریت کے جراثیم پیدا کئے تو یکلخت فیصلہ صادر کیا واپس چلو!

بوریت نے ان میں مایوسی پیدا کر دی تھی۔ ہم تمام دوست، جو بقول شاہ صاحب ان کے نیاز مند ہوا کرتے ہیں، کا اکثریتی فیصلہ تھا کہ جب شاہ صاحب بور ہونے کا تاثر دیں تو ان سے فوراً دور ہو جاؤ۔ اکثر اوقات تو نئے گاہک، اوہ.... نہیں، نئے مرید

سے ہمارا تعارف کرواتے ہوئے یہ بھی فرماتے کہ یہ سب میرے مرید ہیں، آپ حکم دیں اور دیکھیں کیسے منٹوں میں تعمیل ہوتی ہے۔ اور پھر خود ہی ایک ناممکن سا کام کسی بھی نوجوان حاضر مرید کو سونپ دیتے۔ اور سامنے والا نیا مرید حیران و پریشان ایک بڑی سی رقم جو پہلے ہی باتوں باتوں میں بتائی جا چکی ہوتی تھی نذرانے کے طور پر قدموں میں رکھ دیتا۔ تاہم پرانا مرید حکم سن کر اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ کمال یہ تھا کہ بعد میں شاہ صاحب خود ہی خاموشی سے خفیہ طور پر ناممکن کام منع فرما دیتے اور یوں نئے اور پرانے مرید سبھی خوش رہتے۔ بھلے بجلی آئے یا نہ آئے۔

بم ۔ بم

آج صبح جب کالم لکھنے بیٹھا تو لاہور کے گنگا رام ہسپتال کی ایک بم نما خبر نے مجھے چونکا دیا۔ ہوا یوں کہ چند شرابی جو رات کے آخری پہر میں نشہ میں چُور ہسپتال کے کسی کونے میں 'چھپے' بیٹھے بقول پولیس ''غل غپاڑہ'' مچا رہے تھے تو پولیس نے انہیں 'رنگے ہاتھوں' گرفتار کر لیا۔ اور پھر 'چیک اپ' کے لئے انہیں متعلقہ وارڈ میں لے جایا گیا تو شرابیوں نے بم بم کہہ کر شور مچا دیا۔ جس سے افراتفری کا ایک عالم ظہور پذیر ہوا۔ پولیس اور عملے کی دوڑیں لگ گئیں۔ ڈاکٹرز، نرسیں اور سکیورٹی اہلکار سبھی کے سبھی بم کا نام سنتے ہی رات کے اندھیرے میں مریضوں کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ہسپتال سے بھاگ نکلے۔

اس اچانک ہڑبونگ اور بھاگ دوڑ کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ چلنے پھرنے کے قابل مریض تو فوراً اس دوڑ میں شریک ہو گئے۔ تاہم دیگر لوگ حسبِ منشا اور حسبِ

استطاعت مراتھن ریس میں شامل ہونے کی باقاعدہ تیاری میرا مطلب سامان اکٹھا کرنے میں جت گئے۔ کوریڈورز میں انسانوں کا ایک سیل رواں تھا جس میں مریض نرسوں سے ٹکرا رہے تھے۔ نرسیں ڈاکٹرز سے اور دیگر لوگ دیواروں سے۔ سکیورٹی والے چونکہ داخلی اور اندرونی دروازوں پر تعینات تھے لہٰذا انہیں دوڑنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

ایک نفسانفسی کا عالم تھا۔ ہاں البتہ ایک منظر اور بھی نظر آیا کہ جو مریض چل پھر نہیں سکتے تھے وہ رینگ رینگ کر حشرات الارض کی طرح وارڈوں سے یوں باہر آ رہے تھے جیسے ایک عرصے سے اندر قید میں ہوں۔

چونکہ ہسپتال کا زیادہ حصہ زچہ و بچہ وارڈ پر مشتمل ہے لہٰذا اس طرف یہ ہوا کہ اکثر ماؤں نے اپنے لخت جگروں کو بستر کی پائنتی پر چھوڑ مزاج پرسی کرنے والوں کے ساتھ دوڑ لگا دی۔ تاہم جو خواتین حاملہ تھیں انہوں نے دیواروں سے ہاتھ ٹیکتے ٹیکتے برسک واک کر لی۔

مجھے حیرت اس پہ ہے جو خواتین آپریشن تھیٹر میں زچگی کے لئے محو استراحت تھیں وہ کیونکر وہیں لیٹی رہیں۔ میری ذاتی رائے میں زچگی کی تکلیف اور درد جو دیگر تمام دنیاوی مصائب سے بڑھ کر ہے، کو ان خواتین نے درخور اعتنا ہی نہ سمجھا اور یہی وجہ رہی ہوگی جوان خواتین نے وہیں رکنے کو ترجیح دی۔ اس بھاگم دوڑ کا بہر حال منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شرارتی شرابی بھی موقع واردات سے فرار ہو گئے اور نہ صرف فرار ہوئے بلکہ انہوں نے پاکستانی اردوئے معلیٰ میں لفظ بم کے معنی کو ایک نئی رونق بخشی اور ایک نئے انداز سے متعارف بھی کرا دیا۔ پاکستان میں عوام کی نفسیات میں جہاں

اور بہت کچھ منفی عوامل بلا ارادہ اور بلا تخصیص خودبخود شامل ہوتے جا رہے ہیں وہیں اب چند الفاظ اور جملے مثلاً 'طالبان'، 'بم'، 'بھاگو'، 'میں نہیں مانتا'، 'تم کون ہو'، 'مرد بنو اور الزام قبولو' وغیرہ وغیرہ جیسے اردو ڈکشنری کے نئے مطالب اور مفہوم آشکار کر رہے ہیں۔

الٹی گنگا

میں آج صبح جب اپنے کار پورچ سے اخبار اٹھا کر اندر لایا تو پہلی خبر جس پر میری نظر پڑی وہ کمال کی اور ہمہ جہت تھی۔ اسے دیکھتے ہی فوراً میرے ذہن میں یہ محاورہ آیا 'الٹی گنگا کا بہنا'۔

میں نے یہ خبر پڑھی اور حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے بیگم کو نوید دی کہ بتاؤ تم نے آج کیا کیا شاپنگ کرنی ہے؟

بیگم نے پہلے تو ماتھے پر تیوری ڈالتے ہوئے مجھے گھورا کہ اچانک سورج مغرب سے کیسے نکل آیا ہے۔ تاہم اس نے جب میرے چہرے پر مسلسل مسکراہٹ دیکھی تو اسے اندازہ ہو گیا کہ میں یقیناً خوشگوار موڈ میں اسے یہ دعوت عام دے رہا ہوں۔ تو لجاتی ہوئی میرے کندھے سے آن لگی اور کہنے لگی: اللہ خیر کرے مزاجِ دشمناں آج ناساز ہے یا پھر رات کا ہینگ اُون ہے جو یوں بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ اسے اپنے

کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کان تو چھوڑیئے اس نے کبھی میری زبان پر یقین نہیں کیا۔

میں نے جب حلفیہ یقین دلایا تو کہنے لگیں: آج کیا کسی کلائنٹ سے زیادہ فیس مل گئی ہے یا پھر تم نے کہیں ڈاکہ ڈالا ہے۔

میں نے تجسس پیدا کرتے ہوئے دائیں بائیں سر ہلایا اور کہا: نہیں فیس وِیس تو آئی نہیں البتہ یہ سمجھو کہ اب میں نے عام پبلک کی جیب پر ڈاکہ ڈالا ہے اور وہ بھی قانونی۔ آج سے تمہارے گھر کے اخراجات میں کم از کم پانچ فیصد اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دیکھو کہاں رکتا ہے۔

وہ تو پہلے ہی میری آفر پر حیران و پریشان تھی اور اب میری باتیں اسے دیوانے کی بڑ معلوم ہو رہی تھیں۔

میرا ہاتھ پکڑ کر للچائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور مسکراتی ہوئی ایک آنکھ بھینچ کر کہا: جب تک تم سچ نہ بتاؤ گے میں کینیڈا واپس نہیں جاؤں گی۔ میں نے سوچا اس سے پہلے کہ وہ واپسی ٹورانٹو کا سفر ملتوی کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں لاہور میں قیام کا ارادہ کر لے، اسے سچ بتا دینا چاہئے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور قدرے دھیمے لہجے میں پوچھا: اچھا یہ بتاؤ تمہارے پاس کتنے ڈالر بچ گئے ہیں۔

پہلے تو وہ ہچکچائی اور پھر آہستہ سے بولی: چند ہزار تو ہیں۔ یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔

اس لئے کہ آج ڈالر ایک سو پانچ روپیہ کا ہو گیا ہے۔ اب تم مزے کرو جو چیز ایک ڈالر میں آتی تھی اب پچانوے سینٹ میں آئے گی۔ تمہاری بچت ہی بچت۔

کیا مطلب؟ بیگم نے پوچھا۔

مطلب وہی جو تمہیں سمجھ آرہا ہے۔ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''یہ تو بہت برا ہوا'' بیگم بولی۔ اس کا مطلب ہے کہ اب پاکستان میں ہر جگہ مہنگائی راج کرے گی۔

تو پہلے یہاں کون راج کر رہا تھا۔ پہلے بھی اسی طرح مہنگائی نے ہر طرف جھنڈے گاڑے ہوئے ہیں۔ غریب لوگوں کی زندگی اسی طرح ویران اور برباد ہے۔ روزگار میسر نہیں، تعلیم ندارد، ہسپتال مریضوں سے بھرے ہوئے، نوجوان اور ذہین لوگ اپنے ملک کو چھوڑ کر باہر کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ قانون کی بالادستی عنقا ہو چکی ہے۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ کیا افسر، کیا ماتحت، کیا وزیر، کیا مشیر سبھی اپنے اپنے ہاتھوں پر دستانے پہنے فنگر پرنٹ چھوڑے بغیر لوٹ مار میں مصروف ہیں۔ اور تو اور دہشت گردی الگ ہے۔

کیا ہم اسے اپنا ملک سمجھ سکتے ہیں جو ہم چھوڑ کر گئے تھے۔

چند برس پہلے یہی ڈالر ساٹھ روپیہ کا تھا۔ کیا تمہیں یاد نہیں۔ میں نے بیگم سے کہا جو خاموشی سے سر جھکائے میرے سامنے اب یوں کھڑی تھی جیسے سب کیا دھرا اسی کا ہے۔

''اب کیا ہوگا'' بیگم نے پوچھا۔

کچھ نہیں۔ لوگ مہنگائی پر چیخیں گے روئیں گے اور پھر مست ملنگ ہو کر دوبارہ اپنی زندگی میں یوں شامل ہو جائیں گے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہاں البتہ ایک بات اور ہوگی کہ چند کمزور لوگ اپنے آدرش، اخلاقیات اور سچائی سے باغی ہو کر اسی قبیلہ سے جا ملیں گے جہاں لوٹ کھسوٹ کا غلغلہ مچا ہوا ہے۔ برائی اپنی ترویج پر خندہ زن ہوگی اور سچائی اپنا منہ چھپائے ہوئے اس ملک سے فرار ہو جائے گی۔ اور یہی تو ہم چاہتے ہیں۔

پاکستان کے عین مشرق میں واقع تاریخی شہر لاہور میں اپنے آباؤ اجداد اور پرکھوں کے سماجی ورثے کو اپنائے ہوئے نعیم بیگ نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ ملک سے باہر گزارا۔ بنکاری اور فنانشل سروسز میں ایک نام پیدا کیا، انجینئرنگ مینجمنٹ میں بین الاقوامی کمپنیوں کے ساتھ کام کرتے رہے اور پھر 2011ء میں پاکستان واپس آ گئے۔ انگلش اور اردو میں ادبی ذوق رکھنے کی بنا پر جزو وقتی لکھنے لکھانے کا کام کرتے رہے۔ 2008ء سے انگلش میگزین ''ٹیکنو بز'' میں آرٹیکل رائٹر کے طور پر 2011ء تک منسلک رہے۔ انگلش میں ان کا ایک ناول ''ٹرپنگ سول'' 2010ء میں شائع ہوا۔ دوسرا انگریزی ناول ''کوگن پلان'' جلد ہی منظر عام پر آنے والا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کا یہ ناول دھماکہ خیز ثابت ہوگا۔

اردو میں افسانوں کی دنیا گو انہوں نے نئی آباد کی تاہم ان کے بیشتر افسانے روزنامہ ''جنگ'' اور ''دنیا'' کے ادبی صفحات کی زینت بنے۔ زیرِ نظر کتاب ''یو۔ ڈیم۔ سالا'' نعیم بیگ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت سے پہلے ان کی شہرت ہندوستان میں حالیہ ہونے والے عالمی افسانہ میلہ کے توسط سے ادبی دنیا تک پہنچ چکی ہے۔ اور ان کے افسانے پاک و ہند میں یکساں پسند کیے گئے ہیں۔

بک ایج پبلشرز، لاہور۔ پاکستان